شعری مجموعہ

پسِ غبار

یاور وارثی

شعری مجموعہ

پسِ غبار

یاور وارثی عزیزی نوابی

جملہ حقوق بحق ناشرین محفوظ

نام کتاب	:	پس غبار
نام مصنف	:	یاور وارثی عزیزی نوابی
انتخاب	:	مولانا محمد قاسم حبیبی برکاتی
ترتیب	:	مولانا محمد قاسم حبیبی برکاتی
کمپوزنگ	:	اسمائل گرافکس، چمن گنج کانپور فون نمبر 9455306981
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
صفحات	:	۲۳۲
ناشر	:	نجم السعید، رضوان عارف
مطبع	:	
قیمت	:	Rs. 250/-
بہ اہتمام	:	نعت اکیڈمی، کانپور
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۵ء

ملنے کے پتے

۱۔ اسمائل گرافکس چمن گنج کانپور۔۲۰۸۰۰۱
موبائل نمبر: 09580163282, 09335354898

۲۔ نعت اکیڈمی، چمن گنج کانپور
موبائل نمبر: 09455306981, 09415483102

انتساب

پیر طریقت رہبر شریعت مخدوم ملت سر چشمۂ علم و حکمت

حضرت صوفی سید محمد عزیز الحسن شاہ نوابی

لیاقتی ابوالعلائی چشتی قادری

سجادہ نشین آستانۂ عالیہ نوابیہ قاضی پور شریف فتح پور ہسوہ (یوپی)

کے نام

گر قبول افتد زہے عز و شرف

☆

یاور وارثی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	تحریر	صفحہ نمبر
۱	حرف مسرت	سید نورالحسن نوابی ابوالعلائی	10
۲	سخن شجر پہ شاخ قندیل	حقانی القاسمی	11
۳	یاور وارثی کی غزل	پروفیسر شہپر رسول	19
۴	یاور وارثی کے شعری سروکار	ضیاء فاروقی	24
۵	منظر بے غبار	یاور وارثی	28
	حمد، مناجات، نعت		
۱	چمن کی زرد دامنی کو دے کے رنگ زار تو		31
۲	کس طرف کھائی ہے کس طرف راستہ اے خدا رحم کر		33
۳	مہربانی کا خدا سے لائے ہیں دستور وہ		35
۴	سارا عالم یا نبی ہے آپ ہی کے واسطے		37
۵	یہ عطر و عنبر یہ مشک آہو ترے سبب ہے		40
	غزلیات		
۱	سمجھ رہا تھا اُسے اپنا آئنا میں بھی		43
۲	بے فیض تھا چاند کا اُجالا		45
۳	پیرہن موسم باراں نے دیا پانی کا		47
۴	الاؤ سوئے ہوئے تھے غبار بیٹھا تھا		49
۵	میں تھا انتظار میں، مجھ میں انتظار تھا اضطراب آشنا		51
۶	ایک ایک عضو حسن کی تمثیل ہو گیا		43
۷	چشم دریچہ جو وا ہوا صورتِ گُل وہ کھِلا مِلا		55
۸	خاک در کو مرا لباس کیا		57

۹	ساحل کو تہِ موج کو شمشیر سمجھنا	59
۱۰	حرف سوئے لب اظہار نکل ہی آیا	61
۱۱	چل دیا سوئے ہدف تیر مرا	63
۱۲	نشانِ قطرۂ خوں بھی کسی بدن میں نہ تھا	65
۱۳	لغزش ہوئی ہو موجِ نوا سے نہ جانے کیا	66
۱۴	محبوس دمِ فغاں نہ رکھنا	67
۱۵	اسی کے حوالے سمندر ہے میرا	68
۱۶	پہلے جو خار تھا وہی گل کی زباں ہے اب	69
۱۷	کمزور ساعتوں نے سبکسار کر دیا	71
۱۸	اک تارِ عنکبوتِ فصیلِ انا سے ہم	73
۱۹	نہ برسنا تھی نہ برسی یہ گھٹا آخر کار	74
۲۰	فضائے شکست و نصرت و جاہ ایک طرف	75
۲۱	جب اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تیغ نور چراغ	78
۲۲	ندی کے دوسری جانب کھڑا ہے وہ بھی تو	80
۲۳	موسمِ ابرِ گریزاں کی فضا میں چپ ہوں	81
۲۴	نظر بچاتے بھی کب تک مکانِ جاں سے ہم	82
۲۵	تڑپتے رہتے ہیں پانی کے دھارے اپنی جگہ	84
۲۶	یہاں قیام ہے رہتا ہے دھیان اور کہیں	85
۲۷	یہاں تو ذرہ بہ ذرہ ہے کہکشاں روشن	87
۲۸	قریۂ فکر سے نکل وادی و سبزہ زار دیکھ	89
۲۹	کبر و غرور و قہر و غضب بھی خموش ہیں	91
۳۰	جوئے جاں، موج نمو، رنگ ہنر مانگتا ہے	92
۳۱	حریف آئے تو اس کا بھی گھر نکالا جائے	93

۳۲	اک جرعۂ خوشبو نہ ملا سرو سمن سے	95
۳۳	ہم آئے جب تو بجھا کر چراغ در آئے	97
۳۴	اک نئے سلسلۂ خواب کو گھر دینے میں	99
۳۵	روشن ہے اک چراغ جو دستِ غبار میں	100
۳۶	آئیں گے سفر میں کام میرے	102
۳۷	نہ زماں ہے نہ مکاں میرا ہے	103
۳۸	سنگ میں پہلے سے موجود تھی تصویر تری	105
۳۹	وہ مری آواز تھی یا تھی صدا زنجیر کی	107
۴۰	گہر تھا شامل جو زندگی کی امانتوں میں	108
۴۱	موج تھے، تموج تھے، سیل تھے، ہوا ہم تھے	110
۴۲	واہیں سارے دروازے اور نڈر سا لگتا ہے	112
۴۳	باقی ہیں شرار کچھ لہو میں	114
۴۴	سکوں نہ دے سکی دریا کی مہربانی بھی	116
۴۵	بے رنگ بے نشان بلاؤں کی زد میں ہیں	118
۴۶	رات کے ساتھ سفر کرنا ہے	120
۴۷	پرچھائیوں سے چھوٹے پیچھا مرا کسی دن	121
۴۸	زندگی بے رنگ موسم کی کہانی بھی تو ہے	123
۴۹	امکاں سے پرے کارِ ہنر کرتا چلا جاؤں	125
۵۰	دل سے دھڑکنیں گئیں آنکھ سے نظر گئی	127
۵۱	شہر میں جو کائناتِ اہلِ نظر ہے	129
۵۲	اک اضطرابِ مسلسل شبابِ دریا ہے	131
۵۳	یوں تو دیکھنے میں تھا ابر کوہسار میں	133
۵۴	دشت کے دشت ہیں چھانے میرے	134

۵۵	بستر، نہ سکوں، نہ خواب مجھ کو	135
۵۶	مجھ میں ایک سمندر ہے	137
۵۷	وہ بارشیں ہوئیں شمس وقمر نظر نہیں آئے	139
۵۸	موج کو تلوار دریا کو سپر کرتا ہوں میں	141
۵۹	سیاہ رات کو روشن سحر اُسی سے ملی	142
۶۰	روشن و تابناک منظر ہے	143
۶۱	زنبیل میں اک دعا نہیں ہے	144
۶۲	نشانِ پا پہ رکھی تھی نہ سنگِ در پہ رکھی تھی	146
۶۳	شکست و ریخت سے دو چار ہو رہا ہوں میں	148
۶۴	نغمہ سرا ہے منظرِ دشت و لب جُو بھی	150
۶۵	دھوپ کا تھا ہمسایہ میں	152
۶۶	مجھ کو عجب نگاہ سے دیکھا گُلِ بہار نے	154
۶۷	پھرتا عبث ہے کیوں کُو بہ کُو تو	156
۶۸	ہوگئی دفن تموج کا مقدر اوڑھے	158
۶۹	ہوئی جو بارشِ غم آنکھ پھیر لی کیسی	159
۷۰	اوڑھ کے کالی چادر مَیں	160
۷۱	ایک بچہ خاک میں غلطاں کہیں	161
۷۲	خوابیدہ منظروں کو جو بیدار کر گئے	162
۷۳	رقصِ گردابِ ماہ و سال میں ہوں	164
۷۴	مشتعل شعلۂ سفاک ہوا چاہتا ہے	165
۷۵	سمندر آ گیا عاجز گرانی سے	167
۷۶	کسی کی آمد و شد ہے یہاں مکیں کوئی ہے	169
۷۷	گریۂ شب کا مرے اشک فشانی کا مری	171

۷۸	نظارگی کا شوق مِلا چشم وا مِلی	172
۷۹	حیات اوسان اپنے کھو رہی ہے	174
۸۰	زخم کھائے ہیں بہت نام و نسب سے ہم نے	176
۸۱	پشت آئنہ جو ہے منحرف ہوا کرے	178
۸۲	آغوشِ نظر میں اس کا دل ہے	179
۸۳	برق جاں، برق صفت، برق نظر بھی ہونگے	181
۸۴	چھوڑ دیتا ہے ترا ساتھ جہاں چاہتا ہے	183
۸۵	چپ ہوا، ترشیٔ گفتار کہاں ختم ہوئی	185
۸۶	یہیں پہ ختم ہے بستی، مکان آخری ہے	186
۸۷	دل کو کچھ غم نہ کوئی کارِ دگر رہ گیا ہے	187
۸۸	سنگ ساعت کی ضرب ایسی تھی	189
۸۹	دشمن جاں ہوئی سپاہ مری	191
۹۰	اس دور میں علم و فن سزا ہے	192
۹۱	برائے نام جہاں رہ گزر میں خاک نہیں	195
۹۲	جو چیز مثالی ہے مثالی ہی رہے گی	197
۹۳	جو محو کلام مجھ سے ہوا مرا ہی ندیم تھا کہ نہ تھا	199
۹۴	کشتی تو ہم بھنور کی حدوں سے گزار لائے	200
۹۵	دریا اک اختیار کا اظہار ہی تو ہے	201
۹۶	قدم سنبھال کے رکھنا کہ دیکھتا بھی ہے	203
۹۷	جاگتا رہتا ہوں لیکن خواب میں رہتا ہوں میں	205
۹۸	شمشیر سے ملا جو مجھے اپنی آل کی	207
۹۹	کس شعلگی میں قید رہے گزری شب چراغ	209
۱۰۰	خوشبو کچھ ایسی علم و ہنر کے شجر میں تھی	211

۱۰۱	شام کی دہلیز پر شفق کی زبانی	212
۱۰۲	آوارہ گرد ہوں رہ دیوانگی میں ہوں	214
۱۰۳	جگمگاتے ہیں در و بام سحر تک اب بھی	216
۱۰۴	تعمیر تو کرتا ہوں میں دیوارِ انا روز	216
۱۰۵	جو ملا اس استعارے کا جواب میں نے دیکھا	220
۱۰۶	تذکرے جن کے سب داستانوں میں ہیں	222
۱۰۷	ایک بجھتے ہوئے موسم کا نشاں رہ گیا ہے	224
۱۰۸	دست و پا مارتا ہے منظر صحرائی کہ میں	226
۱۰۹	روشن شب سیاہ میں ہوگا ستارا کیا	228
۱۱۰	رباعیات	230

☆

۷۸۶/۹۲

حرف مسرت

ہم جس طرح جناب یاور وارثی کی حمدیہ،نعتیہ اور منقبتی شاعری کو پسند کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر انہیں کی زبانی سنتے ہیں اسی طرح ان کی بہاریہ شاعری بھی بڑے ہی ذوق وشوق سے سنتے رہتے ہیں۔

ہمیں نہایت مسرت وشادمانی کا احساس اس وقت ہوا جب جناب یاور وارثی نے یہ اعلان کیا کہ وہ اپنا بہاریہ مجموعہ کلام بنام ''پس غبار'' چھپوانے جارہے ہیں۔

ہم خانقاہی لوگ تو بس خلوص ومحبت کی قدر کرتے ہیں اور وہ یاور وارثی کو قدرت نے خوب خوب عطا کیا ہے۔''پس غبار'' میں شامل ہر شعر ندرت فکر اور نکہت خیال کا امین ہے۔قاری یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محترم یاور وارثی کو اپنے استاذ گرامی حضرت علامہ الحاج حق بنارسی کی تربیت نے خوب سجایا اور سنوارا ہے۔

دعا ہے کہ دونوں نعتیہ مجموعوں کی طرح پس غبار بھی مقبول خاص وعام ہو۔

آمین

سید نور الحسن نوابی ابوالعلائی

آستانہ عالیہ نوابیہ،قاضی پور شریف ضلع فتح پور(ہسوہ)

حقانی القاسمی

سخن شجر پہ شاخ قندیل

حرف حرف حیرتوں کے در کھولنے والی شاعری روبرو ہو تو ذہنی وجود ایک عجب ارتعاشی کیفیت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ باطن کی قندیلیں خارج میں روشن ہوں تو تخیل کی نئی لہریں ماورائے امکاں سمتوں کا سفر کرنے لگتی ہیں:

چومنے آتی ہے اک شوخ کرن سورج کی
عارض گل پہ چمکتا ہے گہر پانی کا

ہر برگ رہگزر نے مری رہنمائی کی
ہر پھول میرے واسطے قندیل ہو گیا

ندرت وتحیر سے معمور یہ شعر جہاں ایک نئی تخلیقی رہ گزر کا پتہ دیتے ہیں وہیں شاعر کے آئینہ ادراک کا اشارہ بھی بن گئے ہیں۔

تازہ پانی کے لمس سے ہی سخن چہرہ کو شادابی ملتی ہے اس لئے اچھی شاعری ہمیشہ احساس واظہار کے نئے در کی تلاش میں رہتی ہے۔ یاور وارثی نے اپنے تخلیقی بہاؤ کے عمل میں تازہ کاری سے رشتہ جوڑے رکھا ہے مگر تازگی کی رو میں کلاسیکیت کی روح سے تعلق نہیں توڑا ہے کہ جدت اور روایت کے حسن امتزاج سے ہی تخلیقی اظہارات کو تمکنت اور تمازت نصیب ہوتی ہے۔

کلاسیکی شعری لوازمات سے آراستگی کے باوجود احساس واظہار کے نئے امکانات کی جستجو وہ وصف ہے جس نے یاور وارثی کے تخیل کو تکرار اور اظہار کو یکسانیت سے بچائے رکھا ہے۔ نئی رت اور نئے موسموں کی تلاش نے بھیڑ میں بھی ان کی شناخت کو گم نہیں ہونے دیا ہے :

میں نے اک در جو کیا بند کسی طور تو پھر
تیشۂ موج نے کھولا نیا در پانی کا
کس کو دیتا ہے صدا رات کے سناٹے میں
کس کے آنے کی دعا روز کھنڈر مانگتا ہے

یاور وارثی کلاسیکی شعریات کے رموز و اسرار سے آگاہ ہیں۔قدیم اساتذۂ سخن کے رنگ و آہنگ سے آگہی بھی ہے۔ان تلمیحات کا بھی علم ہے جن کے اندر حکمت و دانش کی ایک دنیا آباد ہے۔ان کے ادراک اور اطلاق نے بھی ان کی فکر کو نئے زاویے اور شعروں کو معانی کی نئی قبائیں دی ہیں:

رعب بلقیس نوا کے ہیں لبوں پر تالے
میں سلیماں ہوں مگر شہر سبا میں چپ ہوں

اب کہاں کوئی یوسف ہے بازار میں
اس قدر رونقیں کیوں دکانوں میں ہیں

عمر سفر میں تمام کی چھوڑ کے فکر قیام کی
ہفت بلائیں کہیں ملیں اور کہیں کوہ ندا ملا

دشت تلمیحات کی سیاحت آسان سہی مگر لمحۂ موجود سے اس کی مطابقت مشکل ہوتی ہے۔ یاور کے یہ اشعار قدیم و جدید دونوں ذہنی زمانوں کا سفر کرتے ہوئے قارئین تک پہنچے ہیں۔بلقیس، سلیماں، شہر سبا، یوسف اور کوہ ندا اپنے جلو میں جہان معانی سمیٹے ہوئے ہیں۔اور یہ تلمیحات مرور ایام کے ساتھ اپنے تلازمات تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ یاور کے اشعار میں تلمیحات کی معنوی تبدیلی کی اس رو کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور اسے عصری حسیت سے جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے۔عتیقیت اور جدیدیت کا یہی وہ سنگم ہے جس نے یاور وارثی کے تخلیقی وجود کو تحریکی تعینات سے ماورا کر دیا ہے۔انہوں نے ماضی کو مستقبل کے کینوس پر اس طرح نقش کر

دیا ہے کہ زمانوں سے مربوط احساسات اور اظہارات بھی ایک تسلسل کی صورت نظر آتے ہیں۔

یاور کے موضوعی منطقہ میں افکار کی وہ لہریں مرکزی اہمیت رکھتی ہیں جن کا رشتہ ان ازلی تہذیبی قدروں سے ہے جن سے انسانیت کو معراج ملتی ہے۔ جذباتی وحدت کی فضا میں پرواز کرنے والی یہی تہذیبی اخلاقی اقدار انسان کو اپنے وجود، منشاء و مقصد حیات سے متعارف کراتی ہیں۔ تقدیس انسانیت، احترام آدمیت یاور کی شاعری کا روشن نقطہ ہیں۔ یاور اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ:

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

یاور کے احساس میں اثبات ہے، منفیت نہیں۔ ایقان ہے تذبذب نہیں۔ امید ہے، مایوسی نہیں۔ ان کا فلسفۂ حیات اس طرح شعر کا روپ لیتا ہے:

ہر صبح ہے رات کی نشانی
ہر رات ہے صبح کا حوالا

بے ثباتی اور تغیر کا یہی فلسفہ ہے جس نے یاور کے ذہن کو اس منفیت سے محفوظ رکھا ہے جو نہایت مہلک ہوتی ہے اور یہی تغیر ان کے نزدیک تحرک کی علامت بھی ہے:

ہر بھنور میں رقص کرتی ہیں قضا کی ساعتیں
ہاں مگر تازہ تحرک کی نشانی بھی تو ہے

اسی خیال کی روشنی اس شعر میں بھی ہے:

کچھ دیر میں عروج کی ساعت بھی آئے گی
پہونچیں اب اختتام پہ صدیاں زوال کی

یاور نے وقت کے فلسفہ کو صحیح تناظر میں سمجھا ہے اسی لئے وقت ان کی شاعری میں انسانی تقدیر کی تبدیلی کا مرکز قرار پاتا ہے اور یہی وقت انسانی وجود کو مختلف کیفیات اور مراحل سے گزارتا ہے۔ اور جو فرد وقت کی روح اور رمز سے آشنا ہوتا ہے وہ تبدیلی حالات سے مضطرب نہیں ہوتا۔ اس کا یقین متزلزل نہیں ہوتا۔ یاور کہتے ہیں:

مرکز حرف کائنات ہوں میں
وقت نے مجھ میں انعکاس کیا

اسی سلسلۂ خیال کی لو ان شعروں میں جگمگا رہی ہے:

جہت در جہت سر پٹکنا ہے مجھ کو
کہ جہد مسلسل مقدر ہے میرا

اے شب ہجر نہ حیراں ہو بہت
تو ہے سرمایۂ تقدیر مرا

اک وصل کی ساعت نے کیا روز کنارا
اک ہجر کا لمحہ مرا مہمان بنا روز

یہ احساس کا ایک اثباتی جزیرہ ہے۔ اس میں حرکت و عمل اور تقدیر کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے وہی انسانی زندگی کی حقیقت ہے۔ زوال و عروج، ہجر و وصال سب عارضی کیفیتیں ہیں۔

یاور کی تخلیقی آنکھ پس غبار منظر کی تلاش میں ہے جس کی معرفت سے بہت سی منزلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر وہ منزلیں جن کا ادراک عام انسانی آنکھیں نہیں کر سکتیں:

ادھر غبار کے میں ہوں پس غبار بھی میں
یہ شش جہات مرے عکس کے سوا کیا ہیں

میرا ہی وجود ہے کائنات انجذاب
میری سمت شعلگی منعطف ہوا کرے

انسانی وجود کی معرفت کا اس سے بہتر شعری حوالہ نہیں مل سکتا۔ انسانی وجود کی کائنات انجذاب سے تعبیر ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یاور نے انسانی وجود اور اس کے مقدرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور موزوں بیان سے اس کے تمام زاویوں کو روشن کر

دیا ہے۔فلک اور زمین کے تضادی رشتوں کے حوالے سے یہ شعر ان کے زمین ذہن کی بلندی کا معنی خیز اشاریہ ہیں:

افلاک سے زمیں کا سفر کر رہا تھا میں
سرشاریوں کی ریت مگر بال و پر میں تھی

جو فلک پہ میں نے دیکھا رخ آفتاب روشن
تو زمین پر جوابِ تب و تاب میں نے دیکھا

زمین اور مٹی کے حوالے سے یاور وارثی کے جو شعر ہیں وہ انسانی عظمت اور قوت و حرکت کی طرف اشارہ کناں ہیں۔ان کے شعروں میں وہ معاشرتی زمینیں بھی ہیں جن میں تعلقات اور رشتوں کی حدت وحرارت، دراڑ اور دوریاں تلاش کی جاسکتی ہیں:

ہم نے تو خاک حرف تعلق پہ ڈال دی
نفع و ضرر سے اب کوئی رشتہ ہمارا کیا

وہ گیا وقت ہے کیا ذکر کروں میں اس کا
اس سے اب کوئی تعلق ہی کہاں رہ گیا ہے

بجھے صحرا کی وحشتوں کے چراغ
دیکھ کر حالت تباہ میری

بستی کے اک مکان میں روشن ہے اک چراغ
ہر شخص کہہ رہا ہے کہ میں روشنی میں ہوں

یہ شاعری ان کی جذباتی، ذہنی اور داخلی زندگی کا منظر نامہ نہیں بلکہ اجتماعی شعور وادراک کا بھی مظہر ہے۔ان شعروں میں جدت ادا اور بندش کی چستی قابل داد ہے۔

یاور کو 'خاک' سے خصوصی نسبت ہے اور اسی کلیدی لفظ 'خاک' نے ان کی شاعری کو آسماں کیا ہے۔ یہ لفظ خاک معنوی تلازمے کی تبدیلی کے ساتھ ان کی شخصیت اور فکر کا شناس نامہ بن گیا ہے:

پیرہن موسم باراں نے دیا پانی کا
سلسلہ ختم ہوا خاک کی عریانی کا

اس نے اڑائی تھی جو کبھی کھیل کھیل میں
وہ خاک رہ گزار ہی یہ آسماں ہے اب

ذوق سفر بڑھ گیا ہے اور ہمارا
خاک اڑانے کی جب ہواؤں نے ٹھانی

ہوا کے دست ہنر کا کمال ہے ورنہ
مزاج شعلگی برگ شجر میں خاک نہیں

برائے نام جہاں رہ گزر میں خاک نہیں
کشش مرے لئے ایسے سفر میں خاک نہیں

یاور کے یہاں خاک اور آدم خاکی کی عظمت کا نغمہ علامہ اقبال کی اس فکر سے ان کا ذہنی رشتہ جوڑتا ہے جس کا مرکز انسان کامل ہے۔ یاور کا انسان بھی اقبال کے انسان کی طرح فاتح فطرت اور فاعل ومختار ہے۔ اور یاور کی خاک بھی ایسی ہے جس کی سرشت میں کوکبی ومہتابی ہے:

آسماں خاک بسر پھرتے ہیں قریہ قریہ
رونما مرکز لولاک ہوا چاہتا ہے

فصیل ارض و سما سے دعاؤں کے ہمراہ
لباس نیست پہن کر گزر گیا میں بھی

یاور کی شاعری میں آج کے حالات کا عکس ہے۔ ماحول اور واردات کا بیان ہے مگر بہت سلیقہ سے، کوئی اشتعال اور گھن گرج نہیں اور یہی سلیقہ مندی شاعری کو تاثیر عطا کرتی ہے :

کسی نے آگ لگائی ادھر مکانوں میں
ادھر کئے گئے خاموش بے قصور چراغ

ماحول ہے خموش ہوا محو خواب ہے
تھرا رہے ہیں خوف سے کیوں بے سبب چراغ

یاور کا فکری کینوس وسیع ہے۔ ان کے چراغ جستجو سے نادیدہ اور بے نشاں جزیرے تک روشن ہو گئے ہیں۔ ان کے مشاہدات، تجربات اور مطالعات کی وسعت نے انکے تخلیقی اظہاری تجربوں کو تازگی اور وسعتوں سے ہم آغوش کیا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے شاعری کے لئے تخیل، تفحص الفاظ اور مطالعہ کائنات کی جو شرطیں رکھی ہیں یاور کی شاعری ان شرطوں سے بھی آگے کا سفر کرتی ہے اور خذف نچوڑ کے آب گہر نکال لاتی ہے۔

یاور کی لفظیات بھی ان کے ذہنی سرشتوں کا سراغ دیتی ہے۔ ان کا سلسلہ ان جہانوں سے جوڑتی ہے جہاں لفظ معانی کے ہجوم میں بھی اپنی مخصوص شناخت اور کردار کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان لفظوں میں تہذیب اور تشخص کا نگار خانہ ہے۔ یاور کو لفظوں کی قوت کا احساس ہے اسی لئے ان کے شعروں میں وہی لفظ جگہ پاتے ہیں جو ان کے داخلی جذبات کی مکمل ترسیل کر سکیں اور ماورائے جذبات کا بھی اشارہ دے سکیں۔ چراغ طاق بدن، کف شاخ تمنا، سکوت دشت سماعت جیسی تراکیب بھی ان کی ذہنی قوت اور اظہاری کیفیت کا علامتی نشان ہیں۔

یاور کا سخن چراغ روشن ہے اور سدا روشن رہے گا کہ اس کا رشتہ اس مرکز نور سے ہے جس سے پوری کائنات اکتساب فیض کرتی ہے۔

انسانی احساس کے سمندر کو انہوں نے اپنی شاعری میں جس طرح سمویا ہے یہ ہم

عصروں میں ان کے امتیاز کے لئے کافی ہے۔

جس شاعر کی زنبیل میں ایسے خوبصورت شعر ہوں:

جمال یار تہوں میں اتر گیا شاید
سیاہ جھیل کے اندر ہے روشنی کیسی

اس کی یادوں نے تعلق کا بھرم رکھا ہے
دستکیں دینے چلی آتی ہیں در تک اب بھی

یہ رشتہ سنگ و ثمر کا بہت پرانا ہے
چلے ہیں سنگ بھی جب شاخ پر ثمر آئے

ایسی شاعری پر زندگی کے دستخط ہمیشہ ثبت رہیں گے۔

haqqanialqasmi@gmail.com

Cell : 9891726444

یاورؔ وارثی کی غزل

پروفیسر شہپر رسول
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یاور وارثی کی غزلوں کے جو اشعار میرے پیش نظر ہیں ان کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کی شعری روایت سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کا رشتہ نہایت مستحکم ہے۔ دوسری بات یہ کہ کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید شعری رویّے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہے ہیں۔ ہمارا کاروانِ شعر کن کن گزرگاہوں سے ہوکر یہاں تک پہونچا ہے اور اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے ہیں یاور وارثی اس کے رمز شناس ہیں۔ انہوں نے بھی شعر گوئی کا ہنر اپنے پیشروؤں سے سیکھا ہے لیکن لائق توجہ امر یہ ہے کہ انہوں نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کو الگ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

شاعری اگر واقعی شاعری ہے تو وہ مسرت و بصیرت عطا کرتی ہے لیکن ناقدین یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ آج کی شاعری سے مسرت کے بجائے کرب ہی کرب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے سے دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ انسان زمانے سے تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ ایسے تجربات کو ذریعۂ بصیرت بھلے ہی مان لیں لیکن مسرت سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعصاب کی افسردگی کا کم ہو جانا، ہلکا ہلکا سا محسوس کرنا یا محض مسکرانا ہی مسرت کی علامت ہے؟ کیا ذخیرۂ تجربات و مشاہدات میں اضافے کے سبب زیست کو بہر صورت انگیز کرنے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا اور غبار زمانہ کو بسلامت روی پار کرنا انسان کو بصیرت و مسرت سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ خیر یہ ایک الگ بحث

ہے۔ یاورؔ وارثی نے زندگی سے جو تجربات ومشاہدات حاصل کیے ہیں ان کی آئینہ داری ان کے اشعار میں نہ صرف خوب خوب ہوتی ہے بلکہ قاری وسامع کو بعض اندیکھی سمتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔

دروازے عبث کھلے ہوئے ہیں
کوئی نہیں اور آنے والا

اک شرر کوچۂ جاناں سے اڑا لائی ہوا
اک دیا خانۂ ہجراں میں جلا آخرکار

ہر برگ رہگذر نے مری رہنمائی کی
ہر پھول میرے واسطے قندیل ہوگیا

مرکز حرفِ کائنات ہوں میں
وقت نے مجھ میں انعکاس کیا

وہ روشنی تھی کہ آنکھیں نہ کھل رہی تھیں مری
کوئی چراغ مگر محفل سخن میں نہ تھا

چلے ہیں اک خس جاں لے کے اس طرف کہ جہاں
ہر ایک گام پہ ہے آتش زیاں روشن

شعر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک جہانِ معنی اپنے اندر نہاں رکھتا ہے۔ اس کو سیدھے سادے انداز میں پڑھا جائے تو وہ کچھ اور بیان کرتا ہے اور کسی دوسرے لہجے میں قرأت کی جائے تو وہ فہم وادراک کی کایا پلٹ کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ''دروازے عبث

کھلے ہوئے ہیں‘‘ والے شعر کو ذرا سوالیہ انداز میں پڑھئے اور لفظ و معنی کا کرشمہ دیکھئے۔ یہاں شاعر کے حرف و خیال کو نقش کرنے والے شعری کردار کا یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی آنے والا نہیں ہے، دروازوں کے بند کرنے کے حق میں نہ ہونا زندگی کی گہری معنویت کو اجاگر کرتا ہے نیز نقش ناامیدی کو سایۂ امید میں بدل کر تجربے کی ایک نئی سمت کو روشن کر دیتا ہے۔

یاور وارثی کے اشعار دھیان کے کتنے ہی دریچوں کو وا کرتے ہیں اور لفظ و معنی کی کئی سطحوں اور سمتوں کا سراغ دیتے ہیں۔ ہوا کے دوش پر ایک شرر کے کوچۂ جاناں سے اڑ آنے پر خانۂ ہجراں میں ایک چراغ کا روشن ہو جانا، ہر برگِ رہگذر کا رہنما بن جانا اور ہر پھول کا قندیل میں بدل جانا، شاعر کے متکلم کا انعکاسِ وقت کے سبب مرکز حرف کائنات بن جانا، محفل میں چراغ سخن کے نہ ہونے کے باوجود آنکھوں کا روشنی سے چندھیا جانا اور انسان کا ہر قدم پر آتش زیاں سے گذرنا ایسے شعری تجربات ہیں جو تخلیقی تنوع اور ہمہ جہتی کے ساتھ ساتھ وسعتِ نگاہ کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا تھا کہ ’’نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی‘‘ دنیا کس طرح بدل جاتی ہے۔ وقت کیسے کیسے شعبدے دکھاتا ہے۔ کبھی ہمدرد بن جاتا ہے کبھی اس کی کروٹیں باعث اندمال ہوتی ہیں اور کبھی وہ اس قدر سفاک ہو جاتا ہے کہ محلوں کو کھنڈر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وقت کی ویرانی کسی کے لئے دست بہ دعا نظر آتی ہے۔ بام و در، بستیاں اور چہروں کے نقوش نظر کی سرحدوں سے دور ہوتے جاتے ہیں اور لوگ لباس نیست پہن کر فصیل ارض و سما سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس طرح تاریخ اپنی کہانی کہتی ہے اور حال اپنا حال بیان کرتا ہے۔ بقول شاعر:

کس کو دیتا ہے صدا رات کے سناٹے میں
کس کے آنے کی دعا روز کھنڈر مانگتا ہے

نہ بستیاں تھیں، نہ وہ بام و در نہ وہ چہرے

ہمارے قافلے جس وقت لوٹ کر آئے

فصیلِ ارض و سما سے دعاؤں کے ہمراہ
لباسِ نیست پہن کر گذر گیا میں بھی

لیکن غزل کو بُتِ ہزار شیوہ اور انتہاؤں کا سلسلہ یوں ہی نہیں کہا گیا۔ تخلیق کار کی نظر کوزہ گر کے چاک پر بھی رہتی ہے اور زرخیزیِ نمناکیِ خاک پر بھی رہتی ہے۔ اچھے شاعر کی انگلیاں نبضِ وقت کے نشیب و فراز کو سمجھتی ہیں اور نئی ساعتوں کی بدلتی ہوئی شکلوں اور نئے تقاضوں کو قبول بھی کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ اس طرح گویا ہوتا ہے:

بادل گھرے، ہوائیں چلیں، خوشبوئیں اڑیں
اور برق کوندنے لگی فکر و خیال کی

کچھ دیر میں عروج کی ساعت بھی آئے گی
پہنچیں اب اختتام پہ صدیاں زوال کی

بے سمت و نشاں عزمِ سفر باندھ کے اٹھوں
تسخیر نئی راہ گذر کرتا چلا جاؤں

آبجوئے وقت میں دور تک اتر گئی
لَو مرے چراغ کی میرا کام کر گئی

شور مچ گیا تمام انقلاب آ گیا
آج مجھ کو دیکھ کر روشنی ٹھہر گئی

سماعتوں پہ ہے طاری سرور کا عالم
بہت حسین صدائے رباب دریا ہے

یاور وارثی کی شاعری میں تخلیقی تجربات لہروں کی طرح پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا لہجہ بہاؤ اور نشیب و فراز سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک حساس اور صاحبِ نظر شاعر ہیں۔ نئے مضامین کے ساتھ ساتھ بعض روایتی مضامین کو بھی ندرتِ ادا سے نکھار دیتے ہیں۔ ان کی غزلیات میں روایت کا احترام اور جدّت کی کارفرمائی کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ میرا خیال ہے یاور وارثی کا مجموعہ ''پس غبار'' اہل ذوق کے لئے بہترین تحفہ ثابت ہوگا اور شعری ادبی کتب میں خوبصورت اور بامعنی اضافہ کا موجب بنے گا۔

پروفیسر شہپر رسول
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یاور وارثی کے شعری سروکار

ضیا فاروقی، بھوپال

شمالی ہند کے وہ شہر جو تاج برطانیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھے ان میں کانپور کو یقیناً فوقیت حاصل رہی کہ یہاں روز اول سے ہی اردو کو نہ صرف یہ کہ سرکاری زبان کا درجہ ملا بلکہ یہاں کا شعری سرمایہ بھی حاکم وقت کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی سے کسی حد تک پاک رہا۔ اس کے برعکس عام طور پر یہاں کی تہذیبی اور لسانی فضا میں احتجاج، انتشار اور بیباکیٔ گفتار کے رنگ زیادہ گہرے نظر آتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو اہل کانپور کی شاعری پر کسی مخصوص ادبی دبستان کا بھی کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا بلکہ یہاں کے بیشتر شعراء بقول حامد حسن قادری

لکھنوی کی نہ دہلوی کی طرف
ہم زباں میں نہیں کسی کی طرف

کا عملی نمونہ پیش کرتے رہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ادبی دنیا میں آئے تغیرات کا اثر یہاں کے اہل قلم نے قبول نہ کیا ہو کہ بیسویں صدی کی بیشتر دہائیاں جن تحریکوں، تجربوں اور رویوں کے حوالے سے اپنی مخصوص شناخت رکھتی ہیں، ان کا اثر یہاں کے شعراء نے بہر حال قبول کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی۔ خصوصاً بیسویں صدی کے ربع آخر میں جن شعراء نے اس کوچہ میں قدم رکھا ان کے سامنے وہ غبار رہ منزل بھی تھا جو ہواؤں کے رخ کا پتہ دے رہا تھا اور چمن کے باہر بکھرے جام بہار کے وہ رنگ بھی تھے جو زیب غوری جیسے بانکے شاعر کے جوش کا نتیجہ تھے چنانچہ انہیں ہواؤں اور ہواؤں میں اڑتے رنگوں کو اپنی گرفت میں لے کر کانپور کے جن شعراء نے نئی بساط سخن سجائی ان میں یاور وارثی کا نام معتبر بھی ہے اور

محترم بھی۔

یاور وارثی خانقاہ سخن کے ایسے اورنگ نشین ہیں جن کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ ان کا سلسلۂ سخن اپنے والد ماجد علامہ افسر ناروی کے حوالے سے حضرت نوح ناروی تک پہونچتا ہے۔یہی وجہ ہے یاوروارثی کے یہاں زبان وبیان کی لطافتیں بھی ہیں اورفکری پرواز کی وسعتیں بھی۔تصوف کی رنگ آمیزی بھی ہےاورحالات حاضرہ کی کم وکیفی بھی۔یہ ضرور ہے کہ زمانی بعد کے سبب یاوروارثی کی نظر میں جہانِ بسیط کے وہ دھندلے اجلے نقوش بھی ہیں جو ہمارے عہد میں شناخت کئے گئے۔یاور کے یہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید طرز تکلم نہایت دلکش انداز میں نظر آتا ہے۔

آواز بھی دینے پہ اگر آ نہ سکوں میں
مٹی کو مرے پاؤں کی زنجیر سمجھنا

پوچھنے آیا ہے وہ آخری خواہش میری
آخرش موقعۂ اظہار نکل ہی آیا

تنگ تھا لمحۂ عشرت کی رجز خوانی سے
غم سنبھالے ہوئے تلوار نکل ہی آیا

نہ بستیاں تھیں نہ وہ بام و در نہ وہ چہرے
ہمارے قافلے جس وقت لوٹ کر آئے

ہمارا عہدکئی معنوں میں عہدگزشتہ سے زیادہ تیز رفتار اورمنفرد ہے کہ سائنسی ایجادات اور مادیت کی بہتات نے زندگی اوراس کی قدروں کویکسر بدل کررکھ دیا ہے ۔یاوروارثی نے بھی اسی عہد میں آنکھیں کھولی ہیں چنانچہ ان کے شعری پیکروں میں ماضی اورحال کے بہت سے مناظرنظر آتے ہیں۔انہوں نے مخصوص علامتوں اوراستعاروں کے حوالے سے عہد حاضر کا جومنظرنامہ پیش کیا ہے وہ اپنی روانی اورمتاثرکن بیانیہ کے سبب قاری

کے ذہن پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے۔ان کے یہاں لفظوں کا اپنا ایک نظام موجود ہے۔ یہ الفاظ کہیں کیف ونشاط کی علامت بنتے ہیں اور کہیں غم ویاس کے رنگ ابھارتے ہیں۔انہوں نے جہاں سہل ممتنع میں خوبصورت شعر کہے ہیں وہیں سنگلاخ زمینوں میں بھی سلاست اور روانی کا ایک دریا بہایا ہے۔خصوصاً بحروں کے انتخاب میں ان کا اپنا ایک خصوصی انداز ہے:

موج موج دائرے قوس قوس زاویئے کچھ نہ تھے مرے لئے
رخت زندگی مرا اور مرا شعار تھا اضطراب آشنا

تڑپتے رہتے ہیں پانی کے دھارے اپنی جگہ
جمے ہوئے ہیں ندی کے کنارے اپنی جگہ

کسی نے آگ لگائی ادھر مکانوں میں
ادھر کئے گئے خاموش بے قصور چراغ

ماحول ہے خموش ہوا محو خواب ہے
تھرا رہے ہیں خوف سے کیوں بے سبب چراغ

ہر بھنور میں رقص کرتی ہیں قضا کی ساعتیں
ہاں مگر تازہ تحرک کی نشانی بھی تو ہے

میں تھا گرداب بلا خیز کے ہاتھوں میں کہ تو
ناپتا تو مرے دریاؤں کی گہرائی کہ میں

ان کے فکری تخیل میں جہاں کائنات اپنی تمام تجلیات کے ساتھ روشن ہے وہیں خالق کائنات کے تئیں ان کی عاجزی اور انکساری کے نمونے بھی لفظ در لفظ اشعار میں پوشیدہ ہیں۔

یہاں تو ذرہ بہ ذرہ ہے کہکشاں روشن
ہے آسماں سے زیادہ یہ خاکداں روشن

ادھر غبار کے میں ہوں پس غبار بھی میں
یہ شش جہات مرے عکس کے سوا کیا ہیں

پڑی ہے خاک مناظر کی آنکھ میں یاور
یہ راز کھلتا نہیں ہے پس غبار ہے کیا

سماعتوں پہ ہے طاری سرور کا عالم
بہت حسین صدائے رباب دریا ہے

بے سمت و نشاں عزم سفر باندھ کے اٹھوں
تسخیر نئی راہ گزر کرتا چلا جاؤں

بہرحال جذبات کیف ونشاط ہوں یا احساسات رنج والم یاور وارثی نے درون ذات اور بیرونی واقعات وحادثات کو نئی علامتوں اور جدید استعاروں کے حوالے سے ایک خوش رنگ پیکر عطا کیا ہے۔ان کے سخن ساز ذہن نے یہاں جو چراغ روشن کئے ہیں وہ اپنی تب وتاب کے سبب عہد حاضر کا اگر مکمل شناخت نامہ نہیں ہیں تو اس کا ایک مستحکم حوالہ ضرور ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں یاور وارثی کے شعری سروکار پر خاطر خواہ گفتگو نہ کرسکا کہ ان کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ اب ہمارے سامنے ان کا ایک شعری انتخاب کتابی شکل میں آرہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا آنے والا یہ شعری مجموعہ اہل ذوق کے درمیان ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

.....ضیاء فاروقی، بھوپال

منظر بے غبار

.....یاور وارثی

'پس غبار' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ میرا پہلا بہار یہ مجموعہ ہے بھی ہے اور میری تیس سالہ ادبی جدوجہد کا نچوڑ بھی۔ اس میں کچھ ابتدائی کلام بھی شامل ہے لیکن اس میں اتنا زمانی بعد نہیں کہ میں ان کے لئے الگ باب قائم کرتا۔ اس سے پہلے دو نعتوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے دونوں مجموعوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایسی پذیرائی کی کہ شاید جس کے لائق میں نہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ آپ کی حوصلہ افزائیوں کے سبب مَیں مسرتوں کے پر لگا کر آسمانوں پر اُڑ رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے محترم و معظم جناب وقار برکاتی (طاہری) سے اپنے کلام پر با قاعدہ اصلاح لی۔ انہوں نے بڑی ہی شفقتوں اور محبتوں سے میری رہنمائی کی۔ آج میرے کلام میں جو کچھ تازگی اور نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے وہ انہیں کی ذہن سازی کا نتیجہ ہے۔ کچھ دنوں بعد کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں حضرت علامہ الحاج حق بنارسی صاحب (مرحوم و مغفور) سے منسلک ہو گیا اور ان کی آخری سانس تک انہیں سے منسلک رہا۔ وہی میرے آخری استاد ہیں۔

میری شاعری کی شروعات غزل گوئی سے تقریباً ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ نعت تو بہت بعد میں کہنی شروع کی لیکن جب شروع ہوئی تو اللہ اور اس کے رسول کا فضل ہوا اور بہت جلد اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ برگ ثنا وجود میں آیا۔ میرے دوست کم اور چھوٹے بھائی زیادہ مولانا محمد قاسم حبیبی برکاتی اس مجموعے کی اشاعت کے محرک بنے۔ اگر ان کی اور چند مخلص احباب کی کوششیں نہ ہوتیں تو شاید مجموعہ نہ چھپا ہوتا۔ برگ ثنا ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا۔

میری زندگی میں ایک لمحہ وہ بھی آیا جب حضرت سید نور الحسن نور نوابی قبلہ سے میری

ملاقات ہوئی۔ خاص بات یہ ہے کہ میری ان کی ملاقات کے درمیان نعت پاک معتبر حوالہ بن کر موجود ہے۔ ان کی عمر تو مجھ سے بہت کم ہے لیکن ان کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ وہ میرے ساتھ تعلق بالکل اس طرح رکھتے ہیں جیسے کوئی مخلص چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے رکھتا ہے۔ انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ رتبے میں بلند و بالا ہیں۔ ''وجدان'' انہیں کے پرخلوص اصرار سے منظر وجود پر آیا۔ ۲۰۱۱ء میں وجدان اشاعت پذیر ہوا۔

میرے اوپر میرے ابو (والد صاحب) کا قرض تھا جو بہت دنوں سے میرے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ ابو کا کلام میرے پاس محفوظ تھا اور تشنۂ اشاعت تھا۔ ۲۰۱۳ء میں نور الحسن میاں کے اصرار نے بالآخر یہ کام بھی مجھ سے کروالیا۔ میرے سر سے ایک بہت بڑا قرض اتر گیا۔

ابھی ۲۰۱۵ء آیا بھی نہیں تھا کہ نور میاں (سید نور الحسن نوابی) نے مجموعۂ غزل کی اشاعت کے لئے کہنا شروع کیا۔ نتیجے کے طور پر ''پس غبار'' آپ کے ہاتھ میں ہے۔ نور میاں کی محبتیں مجھ سے کیا کیا کام لیتی ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ابھی بہت کچھ وقت کے غبار کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ یہ تو سوچنا ہی فضول ہے کہ میں ان کی محبتوں کا کوئی بدلہ دے سکتا ہوں۔ ایسی بے لوث محبتیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

میں محترم و معظم حضرت مجیب الحسن نوابی (حضرت نور الحسن نور نوابی کے چھوٹے بھائی) کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ میرے ہر شعر کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مجھے اس ابوالعلائی گھرانے سے اس قدر محبتیں ملیں کہ میرے دل نے اس شاخ کرم پر آشیانہ بنالیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس گھرانے نے میرے دل کو اپنا غلام اور مرید بنالیا۔ یہ مجھ پر میرے پیارے وارث پاک کا احسان عظیم ہے کہ انہوں نے مجھے اس گھرانے تک پہونچایا۔

حضرت سید نجیب حیدر قبلہ صاحب سجادہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ جیسی میری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں اس کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ کا اثاثہ نہیں ہے۔ میں خلوص دل سے ان کی محبتوں کا شکر گزار ہوں۔

خصوصی طور سے جناب حقانی القاسمی، ڈاکٹر شہپر رسول اور جناب ضیا فاروقی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی گراں قدر آرا سے میرے مجموعۂ کلام کو وقیع بنایا۔

جن لوگوں نے میری تنہائی کے حصار کو توڑنے میں اپنے ہاتھوں کو زخمی کیا اور مجھے ہم سفری کا تحفہ دیا ان کا شکریہ نہ ادا کرنا ناانصافی ہوگی۔ ایسے لوگوں میں سب سے پہلے میری بیوی کا نام آتا ہے جس نے نہ صرف میرے لکھے ہوئے کاغذ کے ایک ایک پرزے کو سنبھال کر رکھا بلکہ ریزہ ریزہ میری بھی دیکھ بھال کی۔ میری بیٹیوں نورافشاں، فرحت ناز، حرا افسر میرے بیٹوں نجم السعید اور رضوان عارف نے مجھے فکر کے صحراؤں میں بھٹکنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔

میں اپنے بھائیوں ظفر عالم، خورشید ابراہیم، قمر عالم، انور عالم اپنے دامادوں نسیم الحق، عبدالباری اور بہنوئی محمد کلیم کا مشکور ہوں۔ ان کی قربتوں نے مجھے بہت کچھ عطا کیا ہے۔

ان کے علاوہ اپنے تمام بزرگوں اور احباب کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میری شاعری کو پسند کیا۔ بزرگوں میں جناب سید ابوالحسنات حقی اور جناب ناظر صدیقی کے نام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ احباب کی ایک طویل فہرست ہے کس کا نام لوں کسے چھوڑوں۔ آصف صفوی تو میرا چھوٹا بھائی ہی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ مولانا محمد قاسم حبیبی اس زمرے سے باہر ہیں جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد میکائیل ضیائی، حافظ قاری طاہر ظفر نیر صابری، مفتی محمد حنیف برکاتی، سید وسیم الحسن ہاشمی، زبیر فاروقی، جوہر کانپوری، زاہد امین خان، واحد امین خاں، مظفر اللہ خاں (راشٹریہ سہارا)، ظفر اقبال ظفر (فتح پور)، صابر فریدی، ریاض الحق ریاض، حسان اعظمی، نواب حسین، فاروق جائسی، سمیع فراز، حنیف صابری، داغ نیازی، کلیم دانش، قاری محمد اختر کانپوری، قاری اسرائیل اختر مسعودی، قاری اقبال بیگ، محمد عمیر برکاتی، محمد عمار برکاتی اور محمد زہیر غزالی برکاتی کے علاوہ ان تمام احباب کا بھی ممنون و مشکور ہوں جن کے نام لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ناموں کی کھتونی میرا مقصد نہیں میں دل کی گہرائیوں سے تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یاور وارثی .....

حمد

چمن کی زرد دامنی کو دے کے رنگ زار تو
شجر شجر کو بخش دے نشاط افتخار تو

سلگتے آفتاب کو تو ابر کا نقاب دے
بکھیرتا ہے دشت میں خزانۂ بہار تو

جہان ہست و بود کی تمام ملک ہے تری
جسے بھی چاہے بخش دے وقار و افتخار تو

بدل سکے ترے سوا کوئی نہ تیرے فیصلے
گدا کو سرخرو کرے بنا کے تاجدار تو

ہزار ڈھونڈنے پہ بھی کوئی کمی نہ مل سکے
تمام خلقت جہاں بنائے شاہکار تو

تجھے جو یاد کر لیا تو راز ہم پہ یہ کھُلا
خزانۂ سکون تو ہے دولت قرار تو

ترے غرور کی نظر کو ناگوار ہو اگر
تو گلستاں کو دفعتاً بنادے خارزار تو

دریچۂ جمال میں بٹھا کے ماہتاب کو
بچھا دے آسمان پر نجوم بیشمار تو

مری نگاہ کو اڑا حد خیال سے پرے
مری فضائے دید کو بنادے بے غبار تو

تو خالق عظیم ہے رحیم ہے کریم ہے
مرے لئے بھی خلق کر متاع اعتبار تو

دماغ ودل کو کھا رہی ہیں الجھنوں کی دیمکیں
ہمارے خاندان پر نوازشیں اتار تو

میان رہگزار ہی چمک اٹھیں گی منزلیں
خدا کا نام لے کے دیکھ یاورؔ ایک بار تو

مناجات

کس طرف کھائی ہے کس طرف راستہ اے خدا رحم کر
ٹوٹتا ہی نہیں سلسلہ رات کا اے خدا رحم کر

راہ انجان ہے سر پہ طوفان ہے سر پھری ہے ہوا
سخت مشکل میں ہے اب چراغِ دعا اے خدا رحم کر

تیری دنیا میں اب حرف حق بولنا جرم سنگین ہے
اور فقدان ہے عزم کا اے خدا اے خدا رحم کر

دھوپ بھی سخت ہے ریت بھی گرم ہے پاؤں اٹھتے نہیں
ختم زادِ سفر قافلے کا ہوا اے خدا رحم کر

اے خدا اے خدا اپنے الطاف کی بارشیں بھیج دے
گرد آلود ہے قلب کا آئینہ اے خدا رحم کر

عدل وانصاف کو دے سکے جو اماں بھیج دے بھیج دے
کوئی صدیق سا کوئی فاروق سا اے خدا رحم کر

جس کے صدقے ملی باغِ اسلام کو اک نئی زندگی
دے شہادت کا وہ شوق وہ حوصلہ اے خدا رحم کر

ڈھونڈتا ہے تجھے کاروانِ نظر آ کے دل میں ٹھہر
تجھ سے مانگے تجھے یاور بے نوا اے خدا رحم کر

نعت پاک

مہربانی کا خدا سے لائے ہیں دستور وہ
خاکِ در بن کر رہوں کر لیں اگر منظور وہ

بلبل و گل کی نوا ، اُن کی ادا کی بازگشت
عشق کا منشور وہ ہیں حسن کا دستور وہ

ذرۂ کوئے نبی کا جس کو حاصل ہے شرف
میری آنکھوں کو کرے گا نور سے معمور وہ

اولیں تخلیق رب کا تاج حاصل کر لیا
منصب محبوبیت پر ہو گئے مامور وہ

جب میں ان کے در پہ استغراق کی حالت میں ہوں
میری خاکستر پہ رکھ دیں کاش دست نور وہ

صرف دنیائے نفس پر ہی نہیں ان کا کرم
ہر طرف ہیں رحمۃ للعالمیں مشہور وہ

اے مرے دل کس لئے بے چین ہے تو اس قدر
رہ نہیں سکتے کبھی اپنے مکاں سے دور وہ

دفعتاً بام و در و محراب روشن ہو گئے
یادِ طیبہ آئی تھی یا خلد کی تھی حور وہ

قیصر و کسریٰ کے پرچم سرنگوں کرنے لگے
تیری خدمت میں رہے جو صورت مزدور، وہ

جن کا چہرہ دیکھنا تیرے مقدر میں نہیں
آنے والے ہیں مرے گھر اے شب دیجور وہ

جس کو دنیا کے کسی منظر سے دلچسپی نہ تھی
دیکھ کر طیبہ کو یاورؔ ہو گیا مسحور وہ

سارا عالم یا نبی ہے آپ ہی کے واسطے
بزم دنیا کی سجی ہے آپ ہی کے واسطے

مجھ کو حاصل زندگی ہے آپ ہی کے واسطے
سانس میری چل رہی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے یہ دل مچلتا ہے مرا
آنکھ میں بھی روشنی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ کی فرقت میں مرجھاتا ہے چہرہ پھول کا
شاخ پر کھلتی کلی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے ہے عشق کی دیوانگی
حسن کی دریا دلی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے سیپوں میں بنتے ہیں گہر
ابر کی آوارگی ہے آپ ہی کے واسطے

چادرِ شب جو ہٹا دے چہرۂ آفاق سے
وہ شعاعِ مہر بھی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے شبنم نے پائی ہے نمود
برگ گل کی نازکی ہے آپ ہی کے واسطے

سر پٹکتی ہیں سر ساحل کہ چومیں نقش پا
بے کلی امواج کی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے دست رحمت کا ہے اُس کو انتظار
شاخِ غم اب تک ہری ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے بلبل کا سوز و ساز ہے
گل کی آنکھوں میں نمی ہے آپ ہی کے واسطے

سنگ کی صورت پڑے ہیں چاہنے والے حضور
فن آئینہ گری ہے آپ ہی کے واسطے

عرش اعلیٰ سے بھی آگے آپ کی ہیں منزلیں
ماہ و انجم کی گلی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے سیراب ہو تشنہ لبی
آب جو داتا سخی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے عرفان کی راہیں کھُلیں
روزنِ نظارگی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ ہی کے واسطے ہے باغ جنت کی بہار
شاخ طوبیٰ خم ہوئی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ کی جانب اشارا کر رہی ہے ہر نظر
ہر نبی ہر اک ولی ہے آپ ہی کے واسطے

آپ کے در کے سوا میں تو نہ جاؤں گا کہیں
میری دریوزہ گری ہے آپ ہی کے واسطے

کیوں نہ پھر مدحت نگاری آپ کی کرتا رہے
نطق یاور وارثی ہے آپ ہی کے واسطے

☆

یہ عطر و عنبر یہ مشک آہو ترے سبب ہے
مرے نبی ہر جہانِ خوشبو ترے سبب ہے

مرا یہ سینہ ہے تیرا گلدستۂ عنایت
جو تیر دل میں ہوا ترازو ترے سبب ہے

خدا نے تجھ کو تری ہی مرضی سے حسن بخشا
مرے نبی اس قدر حسیں تو ترے سبب ہے

ہے تیرے ہی چشمۂ خنک کی تلاش سب کو
یہ آمد و شد کا شور ہرسو ترے سبب ہے

شرر فشانی کے آفتابوں کا ڈر ہمیں کیا
رواں ہر اک آبشار خوشبو ترے سبب ہے

عطا ہو نقش قدم کا بوسہ کہ مطمئن ہوں
جنوں یہ امواج کا لب جو ترے سبب ہے

سلامتی بھی وہ تجھ سے چاہے تجھی سے مانگے
ملے جو یاور کو دست و بازو ترے سبب ہے

غزلیات

☆

وہ نقشِ پا کہاں گئے، وہ شہسوار کیا ہوا
خبر نہیں کہ حادثہ پسِ غبار کیا ہوا

☆

ادھر غبار کے میں ہوں پس غبار بھی میں
یہ شش جہات مرے عکس کے سوا کیا ہیں

☆

پڑی ہے خاک مناظر کی آنکھ میں یاورؔ
یہ راز کھلتا نہیں ہے پس غبار ہے کیا

☆

دکھائی کچھ نہیں دیتا مگر یقیں ہے مجھے
پس غبار تمنا چراغ روشن ہے

☆

سمجھ رہا تھا اُسے اپنا آئنا میں بھی
میانِ کم نظراں کم نگاہ تھا میں بھی

فصیلِ ارض و سما سے دعاؤں کے ہمراہ
لباسِ نیست پہن کر گزر گیا میں بھی

عجب صدائیں تھیں وہ ڈوبتی اُبھرتی ہوئی
نشانِ پائے تجسس پہ چل پڑا میں بھی

لہولہان ہوئی تھی جہاں نگاہ مری
اُسی نواحِ گہر میں بکھر گیا میں بھی

وہی حصارِ انا میں نہیں تھا میں بھی تھا
اگر وہ ہوتا مخاطب تو بولتا میں بھی

مرے ہی تیر تہی دست کیوں پلٹتے ہیں
جب اُس کے نام سے کرتا ہوں ابتدا میں بھی

جہاں مسائلِ آفاق زیرِ بحث رہے
اُس انجمن میں ترے ساتھ ساتھ تھا میں بھی

سکوت ٹوٹنے والا نہیں مگر یاورؔ
اُٹھا کے دیکھتا ہوں محشرِ صدا میں بھی

مرے دماغ کو میرے خدائے صنعت سے
ملی ہے قوتِ تخلیقِ شاہکار بہت

☆

بے فیض تھا چاند کا اُجالا
میں نے یہ نقاب اُتار ڈالا

ہم کو ہی شکار کرنے والا
ذہن اپنا ہے مکڑیوں کا جالا

کرنوں کو زیبِ تن کئے تھا
وہ رشک گلاب و سرو لالا

پہنے تھا خوشبوؤں کی پازیب
اوڑھے تھا بہار کا دوشالا

رخسار پہ سرخیِ حیا تھی
کانوں میں نزاکتوں کا بالا

اُٹھی جو نقابِ روئے روشن
قدموں میں پہنچ گیا شوالا

دروازے عبث کھلے ہوئے ہیں
کوئی نہیں اور آنے والا

کیسی ہے ساعتوں کی بستی
ہر گھر میں لگا ہوا ہے تالا

ہر صبح ہے رات کی نشانی
ہر رات ہے صبح کا حوالا

باز آئے نہ روشنی کے دشمن
اُس نے بھی پلٹ دیا پیالا

کٹ جائے گا حلق نرم و نازک
سونے کا نہ کھایئے نوالا

سب چل پڑے آنکھ بند کر کے
یاور نے جو راستہ نکالا

☆

پیرہن موسم باراں نے دیا پانی کا
سلسلہ ختم ہوا خاک کی عریانی کا

ناؤ رکھ لیتا کوئی پار اترنے کے لئے
میں اگر جانتا سر پر ہے فلک پانی کا

بجھ گئے رنگ، مٹے نقش، تب و تاب گئی
کس نے رکھا در و دیوار میں گھر پانی کا

چومنے آتی ہے اک شوخ کرن سورج کی
عارض گل پہ چمکتا ہے گہر پانی کا

بے ثباتی ہے مرے ساتھ رگ جاں کی طرح
میری بنیاد میں جاری ہے سفر پانی کا

میں نے اک در جو کیا بند کسی طور تو پھر
تیشۂ موج نے کھولا نیا در پانی کا

جستجو کوچۂ جاناں کی ہے فرضِ اول
تشنگی تؤ تو ہے اک کارِ دگر پانی کا

میری کشتی نے جو ساحل پہ پہنچنا چاہا
تو صدا دینے لگا مجھ کو بھنور پانی کا

سنگ پاروں کو بنانے کے لئے آئینہ
قرنہا قرن چلا کار ہنر پانی کا

کیوں بہاتی ہے عبث اشک تری چشم سوال
سنگ سفاک پہ کیا ہوگا اثر پانی کا

یہ جہاں تھا وہیں رہنے دو اسے اے یاورؔ
خشک دھرتی پہ نہ پنپے گا شجر پانی کا

☆

الاؤ سوئے ہوئے تھے غبار بیٹھا تھا
ہنوز قافلۂ نقش پا گزرتا تھا

نگاہ رکھتے تھے آئینے ہر تغیر پر
مرے مکان میں ہر سمت اک دریچا تھا

چھپا لیا تھا اجالا دُھویں کی چادر نے
وگرنہ راہ گزر میں چراغ جلتا تھا

زمین خواب ہوئی ، آسمان گرد ہوا
ابھی رکاب میں پہلا ہی پاؤں رکھا تھا

حصار توڑ کے میں ہو سکا نہ لامحدود
اسی مقام پہ ہر پھر کے مجھ کو رہنا تھا

ہر ایک موج تھی شمشیر بے نیام مجھے
میں آنسوؤں کے سمندر میں آج اُترا تھا

شعاعیں پھوٹ کے افلاک چھو رہی تھیں ابھی
ابھی ابھی تو یہاں اک خزانہ بکھرا تھا

رواں دواں تھا صلیبوں کا قافلہ یاورؔ
شروع تھا نہ کہیں وقت کا کنارا تھا

کسے حصار بناؤں کسے فصیل کروں
دیارِ غیر میں اب کس سے قال و قیل کروں

یہ راستہ کئی صدیوں میں طے نہ ہو پائے
جو اعتبار ترا اے نشانِ میل کروں

☆

میں تھا انتظار میں ، مجھ میں انتظار تھا اضطراب آشنا
ورنہ راہِ شوق میں کون شہسوار تھا اضطراب آشنا

خود سے بے وفا ہوا ، غم سے ماورا ہوا ، کم سے کچھ سوا ہوا
شاخِ گُل کی اوٹ میں برگِ صد بہار تھا اضطراب آشنا

سب حصار توڑ کر کائناتِ حرف میں دور تک بکھر گیا
دستِ ماہتاب میں صوت کا غبار تھا اضطراب آشنا

خوشبوؤں کے دائرے جب فزوں ہوئے تو ہم مائل جنوں ہوئے
ساعتیں تھیں مضطرب، درد کا قرار تھا اضطراب آشنا

پھول تھے خزاؤں کے، رنگ تھے ہواؤں کے، برگ و بار پاؤں کے
کچھ نہیں تھا باغ میں، ہاں، اک انتشار تھا اضطراب آشنا

انتہائے شوق میں منتشر ہوا کبھی اور کبھی سمٹ گیا
اُس کے دستِ ناز میں ایک شاہکار تھا اضطراب آشنا

موج موج دائرے،قوس قوس زاویئے، کچھ نہ تھے مرے لئے
رختِ زندگی مرا اور مرا شعار تھا اضطراب آشنا

یاورؔ اعتبار کی تنگ و تیرہ قید میں تھا اِدھر میں اور اُدھر
وصل کے حصار میں فصل کا شرار تھا اضطراب آشنا

گھر کا ماحول نہیں دیتا مجھے گھر میرا
رات بھر جاگتے رہنا ہے مقدر میرا

ایک ایک عضو حسن کی تمثیل ہوگیا
بے مثل شاہکار بھی تشکیل ہوگیا

افسانہ حرفِ زیست کی تفصیل ہوگیا
عنوان، اک بجھی ہوئی قندیل، ہوگیا

ٹھہرے ہیں ارد گرد پرندوں کے قافلے
اک قطرہ آنکھ سے جو گرا جھیل ہوگیا

چہرے پہ فاصلوں کے اندھیرے ہوئے طلوع
ہر لفظ درد و کرب کی تمثیل ہوگیا

میں آگ کے مزاج سے آگاہ تھا مگر
اس کا اشارہ باعث تعجیل ہوگیا

ہر برگ رہگزر نے مری رہنمائی کی
ہر پھول میرے واسطے قندیل ہوگیا

پانی میں اک بھنور بھی نہ بیدار ہوسکا
مہتاب آسمان میں تحلیل ہوگیا

دیکھا نہیں ہے جس کو کھُلی آنکھ سے ابھی
وہ نقش ایک خواب میں تبدیل ہوگیا

زندہ دلی کے تازہ نشاں چھوڑتے ہوئے
میں اپنے ہی وجود میں تحلیل ہوگیا

اس نے مری پسند پہ چھوڑا تھا فیصلہ
میں ایک آئینے کے لئے کیل ہوگیا

اک ساعت سوال سے فرصت نہیں ملی
وارد اک اور لمحۂ تخئیل ہوگیا

آتی تھی جس سے گنبد بے در میں روشنی
وہ روزن اب مکانِ ابابیل ہوگیا

کمبخت اس کے سامنے کھُلتی نہ تھی زباں
یاورؔ ! قلم ذریعۂ ترسیل ہوگیا

☆

چشمِ دریچہ جو وا ہوا صورتِ گُل وہ کِھلا مِلا
بامِ قبول دُعا تو خود میری دعاؤں سے آ ملا

کوششیں جا نہ سکیں عبث اپنے زیاں کا صلا ملا
حرف سیاہ سے آخرش میرا خیال بھی جا ملا

شاخِ اُفق کا گلاب تھا، سایہ تھا یا کہ سراب تھا
اُتنا ہی مجھ سے وہ کٹ گیا جتنا میں اُس سے گھلا ملا

میری نگاہ کے حوصلے سمت و جہت سے عظیم تھے
اور وہ ہونگے جنہیں ترا نقش قدم سے پتا ملا

یاد نہیں مجھے کچھ مگر ذکر تھا اِس کا اِدھر اُدھر
جب بھی تلاش مری ہوئی تیرے ہی در پہ پڑا ملا

عمر سفر میں تمام کی چھوڑ کے فکر قیام کی
ہفت بلائیں کہیں ملیں اور کہیں کوہِ ندا ملا

دشت بدن نہ تھا آشنا آب نمو کے تپاک کا
موج سیاہ کے لمس سے ذائقہ ایک نیا ملا

میری ریاضتوں کے سبب دُھل گئے وقت کے داغ جب
عکس تمام سمیٹ کر آئینہ اُس سے جا ملا

یاورؔ اسے میں دکھاؤں گا اپنے چراغ بجھے ہوئے
راہِ سفر میں اگر کہیں شعلۂ آئنہ پا ملا

☆

اِس قدر تیز تھی خورشید بدن کی خوشبو
موم کی طرح پگھلتا رہا پیکر میرا

☆

خاک در کو مرا لباس کیا
اُس نے پھر امتحاں میں پاس کیا

دور ایقان و التباس کیا
تار تار اُس نے ہر لباس کیا

اک سمندر کی پیاس دی مجھ کو
اک سمندر مرا گلاس کیا

مرکز حرفِ کائنات ہوں میں
وقت نے مجھ میں انعکاس کیا

پھول، خوشبو، روش، نشیب و فراز
ہم نے اک اک کا اقتباس کیا

روشنی نے محل سرا کے لئے
ایک نقش قدم اساس کیا

کر کے تفویض اپنا لمس دوام
گُل نے گِل کو سخن شناس کیا

آسماں غرق آب ہوتا تھا
جس کو سب نے دھواں قیاس کیا

رگ و پے میں اُتر گیا یاورؔ
خوف نے مجھ کو بے ہراس کیا

موج تھی اُس کے لہو کی کہ وہ ناگن کوئی
پی گئی آتشِ سیّال کے ساغر میرے

☆

ساحل کو تبر موج کو شمشیر سمجھنا
اے کشتیِ دل ہر رخِ تصویر سمجھنا

اعجازِ لبِ یار تھا کچھ اور نہیں تھا
سوکھی ہوئی شاخوں کو بھی شمشیر سمجھنا

آواز بھی دینے پہ اگر آ نہ سکوں میں
مٹی کو مرے پاؤں کی زنجیر سمجھنا

جب فاصلے دل کے لبِ اظہار تک آئیں
دیوار پہ دیوار کی تعمیر سمجھنا

پھرنا مرا اک باغ کی محدود فضا میں
اک پھول کی خوشبو کو ہمہ گیر سمجھنا

بے وقت کہیں جانے کی عادت نہیں مجھ کو
مقصد ہے فقط خواب کی تعبیر سمجھنا

ہر چند کہ خورشید کے چہرے پہ نظر آئے
ہر نقش غلط قابل تسخیر سمجھنا

پوشیدہ مہ و سال کے ہیں سارے خزانے
کافی ہے اسی خاک کو جاگیر سمجھنا

کوئی بھی نہیں میرے سوا میری نظر میں
اس ہوش کو بھی عشق کی تاثیر سمجھنا

آواز سمجھنا مرے اشعار کو یاورؔ
پیرایۂ اظہار کو تصویر سمجھنا

☆

حرف سوئے لب اظہار نکل ہی آیا
خانۂ قید سے عیار نکل ہی آیا

دستکوں میں وہی انداز تھا وقفہ تھا وہی
حلقۂ درد سے بیمار نکل ہی آیا

پوچھنے آیا ہے وہ آخری خواہش میری
آخرش موقعۂ اظہار نکل ہی آیا

تنگ تھا لمحۂ عشرت کی رجز خوانی سے
غم سنبھالے ہوئے تلوار نکل ہی آیا

رخنہ انداز ہوئی شورشِ زنجیر بہت
پھر بھی میں توڑ کے دیوار نکل ہی آیا

سوچتے ہی نہیں اربابِ جنوں اس کے سوا
ذکر لعل لب و رخسار نکل ہی آیا

میں نہ کہتا تھا کہ ہوجائیں گی آنکھیں پتھر
آئنہ جانب بازار نکل ہی آیا

شاخِ گل تک تھی بظاہر تو کوئی روک نہ ٹوک
بڑھ گئے ہاتھ تو اک خار نکل ہی آیا

☆

ڈبکیاں لیتے پرندے وادیٔ شب میں کہیں
چاندنی کے کھیت میں شاخِ صنوبر بوگئے

☆

چل دیا سوئے ہدف تیر مرا
اب کھِلے گا گُلِ تحریر مرا

ہر صدا وسعت صحرا کی اسیر
ہر قدم جانب زنجیر مرا

بے گہر جوئے رواں ہے میری
بے نوا گریۂ شب گیر مرا

وہ ہے اور فطرت سفاک اس کی
میں ہوں اور جذبۂ تسخیر مرا

منتشر خاکۂ ہستی کے نقوش
خواب ناقابل تعبیر مرا

ایک رخ ساری نگاہوں سے نہاں
آئینہ اک رخ تصویر مرا

یہی دل ساعت ظلمت کا نقیب
یہی دل شعلۂ تنویر مرا

اے شب ہجر نہ حیراں ہو بہت
تو ہے سرمایۂ تقدیر مرا

دشت نے مجھ کو اماں دی یاورؔ
گھر ہوا نے کیا تعمیر مرا

تھے جتنے ابر سیر ہو کے چل دیئے مگر مجھے
سمندروں کے آس پاس تشنگی کا گھر ملا

☆

نشانِ قطرۂ خوں بھی کسی بدن میں نہ تھا
بجز مرے کوئی روشن اس انجمن میں نہ تھا

وہ شخص کھینچ رہا تھا نقوش عشرت و کیف
مگر بنام قلم کچھ بھی دست فن میں نہ تھا

وہ روشنی تھی کہ آنکھیں نہ کھل رہی تھیں مری
کوئی چراغ مگر محفل سخن میں نہ تھا

وہ خوشبوئیں تھیں کہ پھٹنے لگا دماغ مرا
عجیب بات تھی اک پھول بھی چمن میں نہ تھا

طلسم زاد مرے ارد گرد رقصاں تھے
وہ سامنے تھا مرے، چاند بھی گہن میں نہ تھا

میں اس کے قرب کی لذت سے ہمکنار تھا جب
مرا وجود بھی یاور مرے بدن میں نہ تھا

☆

لغزش ہوئی ہو موجِ نوا سے نجانے کیا
گزرے ہوں سوچتے ہوئے پیاسے نجانے کیا

اک دستِ غیب آ کے اٹھا لے گیا اُسے
کرتا تھا وہ سوال خدا سے نجانے کیا

شاید یہی سبب ہے تہی دست رہ گیا
وہ کام لیتا حرف و نوا سے نجانے کیا

رکھ جاتی ہے سرہانے دمِ صبح خوشبوئیں
رشتہ ہے میرا بادِ صبا سے نجانے کیا

ہر سمت تشنگی کے سمندر بچھا گئی
موسم نے کہہ دیا تھا گھٹا سے نجانے کیا

ایسی عجیب شئے ہے کہ ہوتی نہیں شناخت
نکلا ہے آبجوئے دعا سے نجانے کیا

یاورؔ مری فصیلِ بدن سے وہ رات کو
دیتا ہے باہر آ کے دلاسے نجانے کیا

☆

محبوس دمِ فغاں نہ رکھنا
یہ اشک پسِ مکاں نہ رکھنا

مدفن ہے آگ کا یہ پیکر
اِس خاک پراب زباں نہ رکھنا

دوری ہی زیب دے رہی ہے
دھرتی پر آسماں نہ رکھنا

قدموں کے نشان جل اُٹھے ہیں
سایہ بھی ابھی یہاں نہ رکھنا

صدیوں کے وار سہہ چکا ہے
اِس طاق پہ داستاں نہ رکھنا

گزریں گے موم سے مسافر
راہوں پر سنگِ جاں نہ رکھنا

☆

اسی کے حوالے سمندر ہے میرا
وہی ایک تنہا شناور ہے میرا

میں خنجر کی وادی میں سفاک دریا
لہو کے پہاڑوں پہ منظر ہے میرا

میں صحرا بہ صحرا پھروں جستجو میں
سرابو ! کہاں پر سمندر ہے میرا

جہت در جہت سر پٹکنا ہے مجھ کو
کہ جہد مسلسل مقدر ہے میرا

یہ ہلچل ہے کیوں سطح دریا پہ یاورؔ
یہ لگتا ہے قاتل شناور ہے میرا

☆

پہلے جو خار تھا وہی گل کی زباں ہے اب
یعنی مرا حریف، مرا جانِ جاں ہے اب

بوسیدہ سی چٹائی شکستہ مکاں ہے اب
کافی مرے لئے یہی زادِ جہاں ہے اب

پہلے تھی جس کی رفعت پرواز دیدنی
وہ صورتِ غبارِ پسِ کارواں ہے اب

جن کے لئے سماعتیں کرتی رہیں پڑاؤ
وہ داستان گو ہیں نہ وہ داستاں ہے اب

جس کی اک ایک ٹیس میں آئے ترا خیال
کافی مرے لئے وہی دردِ نہاں ہے اب

ویرانیاں مقیم ، خموشی ہے خیمہ زن
ہوتے ہوئے مکین کے خالی مکاں ہے اب

اس نے اڑائی تھی جو کبھی کھیل کھیل میں
وہ خاک رہ گزار ہی یہ آسماں ہے اب

آہو تو رم کی آگ میں جلتا ہے آج بھی
حاصل مگر وہ دشت کی وسعت کہاں ہے اب

ہم ایک کوہِ نور کے کھونے پہ ہیں ملول
غیروں کے پاس دولت سیارگاں ہے اب

بخشی تھی جس نے غالب و ناسخ کو زندگی
آسودہ زیر خاک وہ اُردو زباں ہے اب

منزل یہ کون سی ہے سر جادۂ عروج
یاور جو آسمان تھا سر پر، کہاں ہے اب

☆

کمزور ساعتوں نے سبکسار کردیا
خاموشیوں کو مائل گفتار کردیا

ہم راستے سے دور نکل آئے تھے بہت
ٹھوکر میں آکے سنگ نے ہشیار کردیا

لہجے کی لرزشیں وہ چھپا لے گیا مگر
آنکھوں نے اُس کے خوف کا اظہار کردیا

فیاضیوں نے کی جو توجہ مری طرف
مجھ کو بھی اک صلیب کا حقدار کردیا

دن میں بھی میں چراغ تھا لیکن بجھا ہوا
تاریکیوں نے مجھ کو ضیابار کردیا

بادِ صبا نے چوم کے اک پھول کا بدن
خوشبو کو اضطراب سے دوچار کردیا

وہ خطہ بے سوال تھا بے رنگ و نور تھا
اک ساعت تپاک نے گلزار کردیا

مشکل تھی کچھ ضرور کڑی دھوپ میں مگر
بارش نے مجھ کو بے در و دیوار کردیا

یاورؔ مرے چمکنے دمکنے میں دیر کیوں
صیقل نے پتھروں کو خوش آثار کردیا

☆

زمیں کی رفعتوں پہ کیوں ہیں روز و شب کو حیرتیں
کہ آسماں کی وسعتوں میں گھر ملا نہ در ملا

☆

اک تارِ عنکبوتِ فصیلِ انا سے ہم
باندھے گئے ہیں کرمکِ بے دست و پا سے ہم

یہ کس نے اپنے ہاتھ کو دیوار کر دیا
بیساختہ نکل گئے سیلِ ہوا سے ہم

آشفتگی کی خاک بھی پہلو بچا گئی
کاسہ بدست گزرے تھے کوئے جفا سے ہم

بستی میں جب فضائے سماعت نہیں رہی
سربستہ راز لائے ہیں کوہِ ندا سے ہم

خاشاک و خس کو پیرہنِ جاں بنا لیا
کھیلا کریں گے اب گلِ برق آشنا سے ہم

آگاہیوں نے آگ لگادی ہے شوق کی
گزریں گے ہفت خوانِ دیارِ بلا سے ہم

ساحل پہ لکھ رہا تھا جنوں قصۂ سراب
دریا کے پاس جاکے بھی لوٹ آئے پیاسے ہم

یاورؔ ہم اپنے ہاتھ قلم کر کے خوش ہوئے
آخر دعائیں لیتے بھی کس کس گدا سے ہم

☆

دے رہا ہے تشنگی کی داد اک پتھر مجھے
چند تپتے پتھروں کے درمیاں رکھا ہوا

☆

نہ برسنا تھی نہ برسی یہ گھٹا آخرکار
دیکھئے میرا کہا ہو نہ گیا آخرکار

کوششیں دست ہوا کی نہ ہوئیں بارآور
جوئے شب میں ہی مرا سنگ گرا آخرکار

لے گیا دور بہت حرف شکیبائی مجھے
اس نے بھی حیلۂ دل مان لیا آخرکار

کیا بجز ذرۂ دل کاسۂ توقیر میں تھا
اک ٹھوکر جو لگی وہ بھی گیا آخرکار

اک شرر کوچۂ جاناں سے اڑا لائی ہوا
اک دیا خانۂ ہجراں میں جلا آخرکار

تو شررگاہ کو سمجھا تھا کمیں گاہِ نجوم
میں نہ کہتا تھا بہت ہوگا برا آخرکار

اس کی مشاطگی پھر مائل اظہار ہوئی
سرخرو برگ حنا پھر سے ہوا آخرکار

☆

فضائے شکست و نصرت و جاہ ایک طرف
خمار پسند اُس کی نگاہ ایک طرف

مناظر گرد و پیش لہو لہو ہیں تمام
جمی ہے کہیں نگاہِ سپاہ ایک طرف

دریچۂ گل کا شعلۂ حسن اپنی جگہ
جمالِ جہانِ انجم و ماہ ایک طرف

میانِ جلوس گونج رہی ہے کس کی صدا
کہ خاک بسر ہے سطوتِ شاہ ایک طرف

وجاہت سنگ سرخ و سفید اپنی جگہ
لطافت و حسن سنگ سیاہ ایک طرف

ہے ایک طرف وصال کی ساعتوں کا طلوع
شکستگیٔ طلب کی کراہ ایک طرف

یہ شمس و قمر بھی برف حیات کے ہیں حریف
مگر ہے شعاعِ حرفِ سیاہ ایک طرف

نمود کرے جہاں سے ترا سحابِ خیال
کھڑی ہے ابھی وہ شہر پناہ ایک طرف

وہ اُس کے بدن کی لَو میں پگھلتا میرا وجود
تمام خطائیں سارے گناہ ایک طرف

وصال میں یاورؔ ایسی کہاں ہیں کیفیتیں
سوادِ فراق و مشعلِ آہ ایک طرف

☆

جب اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تیغ نور چراغ
شب سیاہ کو کرتے ہیں چور چور چراغ

ہمیشہ رہتے ہیں سورج سے دور دور چراغ
ہیں زندگی کے لئے کتنے باشعور چراغ

ہواؤں نے جو رگ و پے میں بجلیاں بھر دیں
حدودِ خاک زبوں کر گئے عبور چراغ

نقابِ دستِ تہی میں بدن چھپائے ہوئے
سمٹ کے بیٹھے رہے آئنوں سے دور چراغ

عجیب حال ملا کشتگاں کی بستی کا
نظر نہ آئے کہیں مجھ کو دور دور چراغ

مٹے مٹے سے نشانِ قدم بتاتے ہیں
کبھی یہاں بھی رہے ہونگے بالضرور چراغ

دریچے خوف کی چادر لپیٹے سوتے ہیں
پڑے ہیں راہ میں زخموں سے چور چور چراغ

کسی نے آگ لگائی اُدھر مکانوں میں
اِدھر کئے گئے خاموش بے قصور چراغ

ہوا کی تیغ قلم کر گئی ہے جن کو ابھی
انہیں سروں میں چھپائے ہوئے تھے نور چراغ

فضائے شب میں ہوئی تیغ شعلگی رقصاں
چراغ راہ گزر بن گئے طیور چراغ

نجانے کب کوئی شب خون مار دے یاورؔ
جلائے رکھئے کمیں گاہ میں ضرور چراغ

☆

ندی کے دوسری جانب کھڑا ہے وہ بھی تو
فشارِ غم سے نبرد آزما ہے وہ بھی تو

وہ آب و تاب نہیں ظرفِ آب دیکھتا ہے
مری ہی طرح گہر آشنا ہے وہ بھی تو

صدائیں دست بریدہ ہوا سے ہیں مایوس
ہنوز راکھ تلے جی رہا ہے وہ بھی تو

یہ روشنی اسی خوش پیرہن کی بکھری ہے
نواحِ خیمۂ شب میں رکا ہے وہ بھی تو

اسی کے دستِ نوا سے دریچے جاگتے ہیں
کہ طائروں کی طرح بولتا ہے وہ بھی تو

☆

موسمِ ابرِ گریزاں کی فضا میں چپ ہوں
صورتِ شمع کفِ طاقِ دعا میں چپ ہوں

رعب بلقیس نوا کے ہیں لبوں پر تالے
میں سلیماں ہوں مگر شہرِ سبا میں چپ ہوں

حرف کی قید میں آتا نہیں دریا کا خرام
نقشِ حیرت ہوں، لبِ مدح سرا میں چپ ہوں

اس لئے دسترسِ دید میں ہے میرا جمال
میں ابھی شعلۂ نقشِ کفِ پا میں چپ ہوں

وہ کہ اظہار کے ہر بام پہ ہے محوِ کلام
میں کہ خاکسترِ ہر صوت و صدا میں چپ ہوں

بندشیں توڑنا چاہوں تو وہ حائل ہو جائے
کشمکش میں ہوں بہت بندِ قبا میں چپ ہوں

☆

نظر بچاتے بھی کب تک مکانِ جاں سے ہم
چراغ کے لئے گزرے ہر آسماں سے ہم

تمام رات اسی دائرے میں ختم ہوئی
نکل سکے نہ حد شورشِ سگاں سے ہم

کشید کرتے رہے انتظار کے لمحے
گل یقیں سے کبھی شعلۂ گماں سے ہم

دکھا دیں آئینہ اس ذرۂ وجود کو اب
کہاں تک الجھیں گے صحرائے بیکراں سے ہم

بڑے سلیقے سے خاروں نے اپنا کام کیا
سئیں ردائے دریدہ کہاں کہاں سے ہم

سماعتیں ہیں صفیں گرد و پیش باندھے ہوئے
کہ ہم کلام ہیں اس کے قصیدہ خواں سے ہم

گلابِ تازہ و تر شاخِ اعتبار پہ ہے
بھٹک رہے ہیں کہیں برگِ رائگاں سے ہم

دیا ہے زخم یہ شمشیرِ ناز نے اس کی
شناخت اس کو کریں گے اسی نشاں سے ہم

ہمارے خون کی گردش ہے اس کے ہاتھوں میں
ہیں سرخرو ہنر دست مہرباں سے ہم

سکوں کی سانس نہیں لیتیں شوخیاں اس کی
گزرتے رہتے ہیں یاور ہر امتحاں سے ہم

تڑپتے رہتے ہیں پانی کے دھارے اپنی جگہ
جمے ہوئے ہیں ندی کے کنارے اپنی جگہ

نگارشب کی سبک گامیوں پہ مرتے ہوئے
رگوں میں دوڑ رہے ہیں شرارے اپنی جگہ

شعاعِ مہر بجھانے میں ہوگئی ناکام
چمک رہے ہیں فلک پر ستارے اپنی جگہ

کہاں وہ آنچ جو اس کے خیال سے نکلے
وہ حسن اپنی جگہ یہ نظارے اپنی جگہ

بدن سمیٹ کے دیکھا جو اس نے میری طرف
سمٹ کے رہ گئے سب استعارے اپنی جگہ

☆

یہاں قیام ہے رہتا ہے دھیان اور کہیں
میں سوچتا ہوں بنالوں مکان اور کہیں

میں دشت دشت بھٹکتا رہا مگر نہ ملا
ترے وجود کا ہے سائبان اور کہیں

سیاہ رات تھی اور بے چراغ گوشۂ دل
لیا گیا تھا مرا امتحان اور کہیں

تمام چہرے شناسا تھے میرے اپنے تھے
کیا گیا تھا مجھے بے نشان اور کہیں

اُس ایک بات نے تالے لگا دیئے لب پر
نہ اس کے بعد کھُلی یہ زبان اور کہیں

بہت ہے شور شرابا بہت ہے بدمزگی
یہاں سے ہٹ کے گزاریں اک آن اور کہیں

یہ در بھی اہل جنوں کا نگار خانہ سہی
مگر ہے کوئے جنوں زادگان اور کہیں

حدودِ خاک و خرد توڑ کر نکل جائیں
تلاش کرلیں نیا آسمان اور کہیں

نجانے کب ہو ملاقات جزو کی کل سے
مرا بدن ہے یہاں میری جان اور کہیں

اسے یقیں کے سوا کچھ نہ دے سکا یاورؔ
کہ وہم اور کہیں تھا گمان اور کہیں

☆

آؤ دوچار گھڑی اس سے بھی باتیں کر لیں
کتنی افسردہ و مایوس کھڑی ہے دیوار

☆

یہاں تو ذرہ بہ ذرہ ہے کہکشاں روشن
ہے آسماں سے زیادہ یہ خاکداں روشن

چلے ہیں اک خس جاں لے کے اُس طرف کہ جہاں
ہر ایک گام پہ ہے آتشِ زیاں روشن

میں بجھ گیا تو اندھیرے نہ بجھ سکیں گے کبھی
میں جل رہا ہوں تو ہے دشت بیکراں روشن

چراغ جلتے رہیں قہقہے اُبلتے رہیں
نہ ہو سکے گا رُخِ دل شکستگاں روشن

نہ روشنی ہے نہ شعلے مگر تپش ہے وہی
عجب ہے آگ سرِ دوشِ امتحاں روشن

اس آئینے میں مرے عکس کے سوا کیا ہے
زبان پر ہے یونہی ذکرِ دیگراں روشن

ہماری آمد و شد کی چمک دمک ہے تمام
ہماری ذات سے ہے کوچۂ بُتاں روشن

ہر اک دریچے پہ رکھ دی ہے کہکشاں میں نے
مگر ہوا دلِ ہمسائیگاں کہاں روشن

نقوشِ پا کے خد و خال بجھ چکے لیکن
اُسی طرح سے ہے یاور مرا مکاں روشن

دھوئیں کا رنگ تگ و تاز جارحانہ ہوا
مرا مکان چراغوں کا آب و دانہ ہوا

☆

قریۂ فکر سے نکل وادی و سبزہ زار دیکھ
اس کے کرم کی بارشیں بے حد و بیشمار دیکھ

چشمِ نظارہ باز کر جانب ہر سنگار دیکھ
پھولوں کو ایک پھول پر ہوتے ہوئے نثار دیکھ

حرف ونوا کی خوشبوئیں بکھری ہوئی ہیں دور تک
حمد خدا میں محو ہے ہر گلِ شاخسار دیکھ

آبِ رواں میں غوطہ زن ہے کوئی آئنہ بدن
جوئے صدف مثال میں گوہر شاہوار دیکھ

رہ گئی آج تو مرے دست ہنر کی آبرو
صورتِ گُل کِھلا ہُوا سینۂ کارزار دیکھ

کون لہو لہو ہوا کس کے فضا میں پر اُڑے
کون ہدف قضا کا تھا کون ہوا شکار دیکھ

تشنہ لبی کا باب ہے ، سلسلۂ سراب ہے
قیدیٔ دشت آرزو کوئی رہِ فرار دیکھ

مارِ شب سیاہ نے باندھ دیئے قدم مرے
کھینچ دیا بلاؤں نے گرد مرے حصار دیکھ

گرد و غبارِ جستجو زیبِ نگاہ و دل کئے
ہوگا یہیں کسی جگہ یاورِ خاکسار دیکھ

ہر نفس مرحلۂ سخت تھا درپیش مجھے
ٹوٹی بکھری ہوئی سانسوں سے تھا رشتہ میرا

☆

کبر و غرور و قہر و غضب بھی خموش ہیں
آثارِ کوئے نام و نسب بھی خموش ہیں

ویرانیوں کی گریہ و زاری ہے بے صدا
نو واردانِ شہر طلب بھی خموش ہیں

جن پر گراں تھیں آخر شب کی خموشیاں
وہ عاشقانِ بنت عنب بھی خموش ہیں

کیا ابر بد نہاد نے چپکے سے کہہ دیا
کلیاں ہیں چپ، ہواؤں کے لب بھی خموش ہیں

خنجر کی تشنگی نے رگِ جاں بھی ڈھونڈ لی
ہم پر وہ بے حسی ہے کہ اب بھی خموش ہیں

مانا کہ روشنی کے منارے ہیں محو خواب
کیا حاسدانِ تابش و تب بھی خموش ہیں

حیرت ہے کیا جو ہے عجمی طاق بے چراغ
یاور چراغ ہائے عرب بھی خموش ہیں

☆

جوئے جاں، موج نمو، رنگ ہنر مانگتا ہے
خطۂ خاک ہے وہ ، مجھ سے شجر مانگتا ہے

ابر بے فیض گزرتے رہے سر سے اس کے
آج تک بطن صدف ایک گہر مانگتا ہے

ایک اک کر کے روانہ ہوئے منظر سارے
میرا ہمزاد بھی اب اذنِ سفر مانگتا ہے

صرف دیوار سے چھت سے نہیں ہوتی تکمیل
طاق و محراب و در و بام بھی گھر مانگتا ہے

اپنی آرائش و زینت کی سند پانے کو
اس کا ایوانِ بدن میری نظر مانگتا ہے

کس کو دیتا ہے صدا رات کے سناٹے میں
کس کے آنے کی دعا روز کھنڈر مانگتا ہے

اپنی پہچان بنانے کے لئے وہ یاورؔ
میری قوت مرے بازو مرے پر مانگتا ہے

☆

حریف آئے تو اس کا بھی گھر نکالا جائے
شکار گاہ سے اب کے نہ سر نکالا جائے

شکست فاش کا طوفان سر پہ آ پہنچا
بساط کا ہے تقاضا کہ گھر نکالا جائے

زبانِ وقت کو دی جائے اک نئی لذت
زمین سے ثمر بے شجر نکالا جائے

تہی ہے دامن ابر عطا تو یوں کرلیں
خذف نچوڑ کے آبِ گہر نکالا جائے

بہت عجیب ہے اُس کی یہ شرطِ ہمسفری
میانِ راہ نہ رخت سفر نکالا جائے

قلم کی پیاس بجھانی بہت ضروری ہے
کسی پہ خنجر زہراب اثر نکالا جائے

بہت دنوں سے جلایا نہیں گیا ہے چراغ
یہ قرض ہے تو ہر اک بام پر نکالا جائے

نجانے کب سے شرر آشنا ہے دشت جمال
چلو کہ حوصلۂ چشم تر نکالا جائے

چلایا جائے دلِ سنگ پر جو تیشۂ فن
کوئی سپاس گزارِ ہنر نکالا جائے

یہ دور وہ ہے کہ یاورؔ زبان ہی نہ رہے
جو ایک حرف سرِ رہگزر نکالا جائے

☆

اک جرعۂ خوشبو نہ ملا سرو سمن سے
بے فیض پلٹ آئی صبا صحن چمن سے

ہے بات تو جب بول پڑیں ساری لکیریں
واقف ہی نہیں ہے کوئی تصویر کے فن سے

نظروں میں ہے اس گوہر یکتا کا سراپا
کیا لینا مجھے در عدن ، لعل یمن سے

شعلوں کی زباں چاٹ رہی ہے مجھے اب تک
کل جسم مرا چھو گیا اک گل کے بدن سے

ہیں عیش و مسرت کے نقیبانِ گرامی
پرہیز نہ کر آہ و فغاں ، رنج و محن سے

بے جوشِ جنوں دشت زیاں کاٹ رہا ہے
کیوں ترکِ تعلق کیا خوشبو نے ہرن سے

جو صبح کے آنے کی خبر دیتی ہے مجھ کو
زنداں مرا روشن ہے اسی ایک کرن سے

محسوس ہوئی رہ گزرِ شوق میں مجھ کو
اک آگ نکلتی ہوئی پھولوں کے بدن سے

سر کاٹ کے خود کر دیا دشمن کے حوالے
محفوظ بچا لایا مگر ہاتھ کو رن سے

اکثر وہ سر بام نمودار ہوا یوں
جس طرح نکل آتا ہے مہتاب گہن سے

چھیڑا تو بہت وقت خرام اس کو ہوا نے
اک حرف بھی پھوٹا نہ مگر اس کے دہن سے

یاورؔ غزل اس طرز میں کہنا نہیں آساں
چھلکی ہے شراب ایک نئی ، جام کہن سے

☆

ہم آئے جب تو بجھا کر چراغ در آئے
کہ اور کوئی نہ تنہائیوں کے گھر آئے

ابھارنے کے لئے نقش کوزہ گر آئے
تو خود ہی اڑ کے مری خاک چاک پر آئے

جہاں جہاں بھی اندھیروں کی حکمرانی تھی
چراغِ نقشِ قدم ہم جلا کے دھر آئے

فضائے دشت سے مانوس ہوگیا مرا دل
اگرچہ سامنے ہر پھر کے بام و در آئے

نہ بستیاں تھیں، نہ وہ بام و در، نہ وہ چہرے
ہمارے قافلے جس وقت لوٹ کر آئے

یہ رشتہ سنگ و ثمر کا بہت پرانا ہے
چلے ہیں سنگ بھی جب شاخ پر ثمر آئے

نگاہ خم جو ہوئی دل جو خاک راہ ہوا
مرے قریب کئی لوگ معتبر آئے

قدم قدم پہ مری خیر خیریت لینے
کہیں پہ خار کہیں سنگ رہ گزر آئے

کبھی تو موج سخن مہرباں ہو میرے لئے
کبھی تو ہاتھ کوئی دانۂ گہر آئے

یہ دشت کیوں نہیں دیتا کوئی جواب مجھے
یہ کیا کہ بس مری آواز لوٹ کر آئے

عجب ہے عدل کا معیار اُس کی بستی میں
خرد گناہ کرے اور جنوں کے سر آئے

جب اس کے آنے کی امید ہی نہیں یاورؔ
اب اس سے کیا مجھے شام آئے یا سحر آئے

☆

اک نئے سلسلۂ خواب کو گھر دینے میں
سارے منظر ہوئے گم اذنِ سفر دینے میں

کتنے ہی ہاتھ جلے کتنے ہی پیکر جھلسے
دشت خورشید کو سرسبز شجر دینے میں

موجِ محویتِ فن نے سر اُٹھانے نہ دیا
آ گئی رات دریچوں کو سحر دینے میں

ایسی جرأت سے لیا کام کہ دل چیر دیا
کوہساروں نے مجھے راہگزر دینے میں

کچھ زیاں تو نہ تھا صناعیِ قدرت کا تری
سنگِ بے چہرہ کو بھی آئینہ کر دینے میں

بچ بھی سکتی تھی مرے گھر کی نشانی کوئی
ہوگئی دیر ہواؤں سے خبر دینے میں

جل بجھیں کتنی بصارت کی لویں اے یاورؔ
اُفقِ فکر کو خورشید ہنر دینے میں

☆

روشن ہے اک چراغ جو دستِ غبار میں
باندھے ہے کائنات کو اپنے حصار میں

اُٹھی مری نظر تو میں پتھر کا ہوگیا
پانی سے کھیلتے تھے شرر آبشار میں

طوفانِ گرد و باد گزرنا تھا اس لئے
کھینچے گئے خطوطِ نفس ریگزار میں

مٹی کھرونچتے ہوئے ناخن تو گر چکے
سانسوں کا دم بھی گھٹنے لگا ہے مزار میں

ان شب زدہ فضاؤں کی تادیب کیلئے
زندہ ہوں آج بھی میں چراغِ شرار میں

میں نے بھی اپنے ہاتھ لہو میں بھگو لئے
لکھ دینا میرا نام بھی سنگِ وقار میں

پھر آندھیوں نے خاک اُڑانے کی ٹھان لی
گم ہو نہ جائے پھر گلِ منظر غبار میں

تیار ہو رہا ہوں میں اک جست کیلئے
کرتی ہیں انتظار فصیلیں قطار میں

ہر صاحبِ طلسم کی دستار جل گئی
وہ شعلگی تھی حرفِ دعا کے حصار میں

یہ امن ، یہ سکون ، یہ نیرنگی جمال
رہتا ہے کون سلسلۂ کوہسار میں

طوفان اُس کے قہر و غضب کا خفیف نقش
اُسکی دہاڑ گونج رہی ہے کچھار میں

یاورؔ ہے کون آتشِ گل کا مزاج داں
کس کا ہے عکس آئینۂ آبشار میں

☆

آئیں گے سفر میں کام میرے
رہوار ہیں تیز گام میرے

ہر صبح کی روشنی ہے تیری
ہیں سارے سوادِ شام میرے

پیڑوں کی چھاؤں اُس کی تقدیر
صحرا کی ریت نام میرے

سارا تحت الثریٰ ہے میرا
سارے ہی اُفق کے بام میرے

باقی رہے کیوں شفق کی لالی
اس کو بھی کر دے نام میرے

ہے کعبۂ دل میں تیری تصویر
سجدے میرے قیام میرے

اک پھول بھی کر سکے نہ روشن
پتھر تو ہیں گام گام میرے

☆

نہ زماں ہے نہ مکاں میرا ہے
اور کہنے کو جہاں میرا ہے

ساتھ چھوڑا نہ کبھی بھی میں نے
معترف دشتِ زیاں میرا ہے

میں ہی جلتا ہوں پسِ شمعِ فراق
روشنی میری دُھواں میرا ہے

وہم کی ریت پہ پرچھائیں مری
عکس بر آبِ گماں میرا ہے

آگ اُگلتے ہوئے خورشید ترے
سایۂ ابرِ رواں میرا ہے

اک جزیرے میں کئی سال سے قید
لشکرِ وہم و گماں میرا ہے

لئے جاتا ہے سرِ دار مجھے
ہر نفس دشمنِ جاں میرا ہے

بے جہت دشتِ خلا میں یاورؔ
قافلہ اب بھی رواں میرا ہے

اے بادِ قضا پیشہ اوراق اُڑا میرے
شاید کہ یونہی اک دن ہم قریہ بنوں اس کا

☆

سنگ میں پہلے سے موجود تھی تصویر تری
خود چلاتی رہی تیشہ مرا تقدیر تری

میرے سینے میں اترنا تھا ہر اک تیر ترا
میرے ہاتھوں میں تھی لکھی ہوئی تقدیر تری

قافلے نے مرے صدیوں کا سفر ختم کیا
وقت کے پاؤں سے لپٹی رہی زنجیر تری

کتنے لمحوں کا جواں سال لہو ہے اس میں
کتنی صدیوں میں عمارت ہوئی تعمیر تری

صاعقہ وار چمکتی رہی گردن سے پرے
کھیلتی ہی رہی جذبات سے شمشیر تری

رہ گیا صرف گزرتے ہوئے لمحوں کا غبار
اُڑ گئی صفحۂ قرطاس سے تحریر تری

خواب میں خواب دکھا کر جو بتائی تو نے
کس طرح سامنے آئے گی وہ تعبیر تری

بال و پر رہ گئے صحرائے خلا میں یاورؔ
کچھ ترے کام نہ آئی کوئی تدبیر تری

رکا ہوا ہوں یہاں خواب کے اندھیرے تک
سفر کروں گا یقیناً مگر سویرے تک

☆

وہ مری آواز تھی یا تھی صدا زنجیر کی
ورنہ کب دیکھی ہے صورت آہ نے تاثیر کی

آنکھ صحرا تھی مری دل سنگ پارہ تھا مرا
داد دینی ہی پڑے گی قوت تحریر کی

میرے گھر پر آندھیوں کی دستکیں ہونے لگیں
میرے خوابوں نے عمارت جب کوئی تعمیر کی

عکس اس کا ہوگیا محفوظ آنکھوں میں مری
ساتھ میرے چل رہی ہے روشنی تصویر کی

گرد بن کر سر پہ ٹھہرا خاک بن کر پاؤں میں
دل نے اس کے قرب کی سو سو طرح تدبیر کی

اس کا رخ میری طرف ہونے کی یاورؔ دیر ہے
خود بخود جڑ جائے گی ہر اک کڑی تقدیر کی

☆

گہر تھا شامل جو زندگی کی امانتوں میں
نجانے گم ہو گیا کہاں تیرہ ساعتوں میں

لہو کی بارش مٹا نہ دیتی تو ہم بھی پڑھتے
نجانے تحریر کیا تھا پُرنور صورتوں میں

سنائی تو دے رہی ہے دستک ضرورتوں کی
مگر خیانت نہ مجھ سے ہوگی امانتوں میں

پہونچ کے منزل پہ یاد آتا ہے لمحہ لمحہ
ملا تھا جو ذائقہ سفر کی صعوبتوں میں

کوئی صدائے کرم نہ تریاق بن سکے گی
گھلا ہوا ہے وہ زہر اُس کی سماعتوں میں

مری رگوں کو نئے شرارے عطا کئے ہیں
لکھوں قصیدہ حریف جاں کی فضیلتوں میں

نشاں نہ صدیوں کسی بھی مرہم سے مٹ سکیں گے
وہ زخم ہم نے کئے ہیں شامل وراثتوں میں

چلے تو سیراب کرکے تشنہ لبوں کو ٹھہرے
زبانِ خنجر بھی کم نہیں ہے سخاوتوں میں

ہر ایک سیلِ زیاں کا شافی جواب ہم ہیں
مگر ہے تھوڑی سی انکساری جبلتوں میں

کہیں کہیں اُس کا ذکر ملتا ہے اب بھی یاورؔ
نصابِ فرقت میں شامِ غم کی حکایتوں میں

☆

اُس کے کوچے میں ستمگر بھی اسی کے ہونگے
میرے اطراف یہ پتھر بھی اسی کے ہونگے

☆

موج تھے، تموج تھے، سیل تھے، ہوا ہم تھے
کشتیاں سب اُسکی تھیں اور ناخدا ہم تھے

گرد بادِ وحشت کا ایک سلسلہ ہم تھے
بام و در کی خواہش سے جنگ آزما ہم تھے

یوں ہماری آنکھوں میں جاگتی تھی بے خوابی
بے ثبات لمحوں کے رمز آشنا ہم تھے

شہپروں کی جولانی کام آگئی ورنہ
ثاقبِ تغیر کی جستِ نارسا ہم تھے

شہر ماہ و انجم سے بامراد سب لوٹے
کاسۂ تہی ہم تھے ، دستِ بے نوا ہم تھے

کُھل گئی تو کِھل اُٹھّے سب بجھے ہوئے چہرے
اُس کی بند مٹھی میں گوہر عطا ہم تھے

خم بہ خم چمکتی تھی حرفِ حق کی سرمستی
اُس کمانِ روشن کے تیرِ بے خطا ہم تھے

جس کو دیں دُعائیں دیں، ہر طرف صدائیں دیں
خامشی کے صحرا میں حرفِ بے صدا ہم تھے

جگمگاتے دیکھا تو لے اُڑی ہوا یاورؔ
سر کا تاج بننے سے پہلے خاکِ پا ہم تھے

خموشیوں کی فضا اب رہائی دے مجھ کو
کہ اُس کے آنے کی آہٹ سنائی دے مجھ کو

☆

وا ہیں سارے دروازے اور نڈر سا لگتا ہے
پھول اپنی خوشبو سے بے خبر سا لگتا ہے

دشتِ جاں میں پھرتا ہے وہ غزال کی صورت
دھوپ تیز ہو جائے تو شجر سا لگتا ہے

ہر گھڑی نئے منظر آتے جاتے رہتے ہیں
گھر میں بیٹھے رہنا بھی اب سفر سا لگتا ہے

رنگ کون سا اُس نے مَل لیا ہے چہرے پر
معتبر نہیں لیکن معتبر سا لگتا ہے

خواب کے سفیروں کو اب کہاں اُتارا جائے
وہ مکانِ زرتابی تو کھنڈر سا لگتا ہے

کیسے کیسے زہروں سے پرورش ہوئی ہوگی
مارِ سبز بھی اُس کو بے ضرر سا لگتا ہے

پہلا نقشِ پا جس نے آسماں پہ چھوڑا تھا
آج وہ پرندہ بے بال و پر سا لگتا ہے

روشنی سراپا کو چھو کے دیکھنا یاورؔ
کچھ گلاب جیسا ہے کچھ گہر سا لگتا ہے

قدم قدم روشِ گل پہ وہ بہار قدم
ہر ایک شاخِ ادا پر دکھائی دے مجھ کو

☆

باقی ہیں شرار کچھ لہو میں
دیکھوں گا اُتر کے آبجو میں

آنا ہو تو آئیں بڑھ کے آگے
افلاک ہمارے پاؤں چومیں

قرنوں کا سفر کیا کسی نے
کچھ لوگ تھے محو گفتگو میں

نادیدہ و بے نشاں جزیرے
روشن ہیں چراغِ جستجو میں

سنگ اپنا کام کر رہے ہیں
مصروف ہیں آئینے رفو میں

اوڑھے ہوئے برف کا لبادہ
کیوں آپ نکل پڑے ہیں لُو میں

اب ڈوب بھی آفتابِ امروز
ہر چیز نہا گئی لہو میں

یاورؔ یہ ہے دلدلوں کی بستی
آنکھوں سے کہو، یہاں نہ گھومیں

اُس تمکنت آثار نے مڑکر نہیں دیکھا
اس شہر دل آزار میں یہ خوار کہاں جائیں

☆

سکوں نہ دے سکی دریا کی مہربانی بھی
وہ پیاس تھی کہ پیا زہر شادمانی بھی

سوادِ رنگ بھی میں ہوں بساطِ خواب بھی میں
مرے ہی حصے میں آئی ہے گلّہ بانی بھی

ایاغِ رزق بھی میری ہی دسترس میں تھا
مرے ہی نام تھی سانپوں کی میزبانی بھی

وہی جسے خس و خاشاک جانتے ہیں سب
ہوا نے کی ہے اُسی گھر کی پاسبانی بھی

کبھی تھی باعث حیرت قدآوری جس کی
اُسی مکان کی بنیاد میں تھا پانی بھی

اُسی نے مجھ کو کیا آشنائے رمزِ سکوت
اُسی سے ہے مرے دریاؤں میں روانی بھی

مرے وجود سے لپٹی ہے تسمہ پا کی طرح
کہ میری دشمن جاں ہے مری کہانی بھی

تمام وسعتِ سیلِ نگاہ کے ہمراہ
ہے مثلِ نقطۂ پرکار بے کرانی بھی

گھلا تھا اُس کے سخن میں نمِ یقیں یاورؔ
چمک رہا تھا مگر نقشِ بدگمانی بھی

گلیاں شور مچاتی ہیں
سڑکیں پڑی ہیں سب سنسان

☆

بے رنگ بے نشان بلاؤں کی زد میں ہیں
میرے سبھی چراغ ہواؤں کی زد میں ہیں

بھیگی ہوئی ہوائیں بدن چومنے لگیں
اب قافلے ہمارے گھٹاؤں کی زد میں ہیں

کٹ کٹ کے گر رہی ہیں لویں جوئے خوف میں
روشن چراغ تیرہ فضاؤں کی زد میں ہیں

حرفِ غلط کی طرح مٹے جاتے ہیں نقوش
راہیں تمام راہنماؤں کی زد میں ہیں

بینائی جا رہی ہے مہ و آفتاب کی
آئینے شش جہت کے خلاؤں کی زد میں ہیں

کشکولِ بے طلب کی کشش کام آ گئی
سارے بلند و پست دعاؤں کی زد میں ہیں

حیرت سلگ رہی ہے ہر اک شاخِ دید پر
جنگل تمام شعلہ نواؤں کی زد میں ہیں

یاورؔ مری یہ آنکھیں کسی کے جمال کی
بے داغ اُجلی اُجلی رداؤں کی زد میں ہیں

سر پر ہے خورشید سکوت
حرف و نوا کی چادر تان

☆

رات کے ساتھ سفر کرنا ہے
ہم کو یہ معرکہ سر کرنا ہے

منظر لمحۂ آشفتہ کو
نذرِ سیلابِ نظر کرنا ہے

زخم کو پھول بنانا ہے ہمیں
سنگ کو راہ گزر کرنا ہے

یہ جو کونپل ہے مرے ہاتھوں میں
اِس کو صد برگ شجر کرنا ہے

شام کے سر کو کچلنا ہے ہمیں
صبح کو زیر و زبر کرنا ہے

پہلے دل پیش کرو اُس کے حضور
پیش اگر ہدیۂ سر کرنا ہے

زد پہ تلوار کی آ کر یاورؔ
جسم کو اپنے سپر کرنا ہے

☆

پرچھائیوں سے چھوٹے پیچھا مرا کسی دن
ہو پاش پاش یکسر یہ آئینہ کسی دن

پہلا قدم اٹھا ہے دشت خلا کی جانب
پہونچے گی انتہا کو یہ ابتدا کسی دن

بس صبح کے وطن سے کچھ دور رہ گیا ہوں
ہاتھوں میں ہوگا میرے دست صبا کسی دن

طائر سماعتوں کے کب اس سے باخبر تھے
بے برگ و بار ہوگی شاخ صدا کسی دن

راہوں کے پیچ وخم میں گم ہوگئی ہے لیکن
پہونچے گی اس کے در تک آواز پا کسی دن

آنکھیں سنا رہی ہیں حالات اپنے اپنے
دل کا بھی فاصلہ طے ہوجائے گا کسی دن

انجام آرزو کے اس رخ سے کانپتا ہوں
دیکھا تھا اک کھلونا ٹوٹا ہوا کسی دن

ہلکا سا عکس یاورؔ یادوں میں رہ گیا ہے
گزرا تھا سامنے سے وہ خواب سا کسی دن

گزر رہا تھا میں دشتِ جنوں سے جب یاورؔ
قدم قدم پہ سرابوں نے پاؤں پکڑا تھا

☆

زندگی بے رنگ موسم کی کہانی بھی تو ہے
اک بلائے جاں ہوا کی پاسبانی بھی تو ہے

خاک اگر اڑنے لگی دشت سماعت میں تو کیا
خامشی میں شعلۂ معجز بیانی بھی تو ہے

ہر بھنور میں رقص کرتی ہیں قضا کی ساعتیں
ہاں مگر تازہ تحرک کی نشانی بھی تو ہے

راستے میں ہم ٹھہرنا چاہتے ہیں کب مگر
سر پہ اک ابر رواں کی سائبانی بھی تو ہے

بچ نکلنے میں تن آسانی کا پہلو ہی سہی
دھوپ کے ہمراہ موجِ رائیگانی بھی تو ہے

سامنے دیکھو چمکتی ہے وہ چاندی کی لکیر
دشت کی تحویل میں دریا کا پانی بھی تو ہے

مت کرو روشن ابھی یہ خوش گمانی کے چراغ
راہ میں حائل فصیل بے کرانی بھی تو ہے

موردِ الزام وہ آتش طبیعت ہی نہیں
بدگماں یاور فضائے آسمانی بھی تو ہے

پارۂ دل ٹھہرتا نہیں ہے کہیں ہے یہ اک شعلۂ انقلاب آفریں
بے سکونی ہے اس کو سکوں کے لئے اضطراب اس کو بے اضطرابی سے ہے

☆

امکاں سے پرے کارِ ہنر کرتا چلا جاؤں
جو سنگ ملے اس کو گہر کرتا چلا جاؤں

بے سمت و نشاں عزمِ سفر باندھ کے اٹھوں
تسخیر نئی راہگزر کرتا چلا جاؤں

ہر گام پہ تعمیر کروں ایک مکاں میں
پھر سارے مکانوں کو کھنڈر کرتا چلا جاؤں

آجاؤں اگر مسکن اوہام سے باہر
ہر مملکت خواب کو سر کرتا چلا جاؤں

کردوں شب تاریک کو شعلوں کے حوالے
شاموں کو ہم آغوشِ سحر کرتا چلا جاؤں

ابوابِ افق مجھ پہ اگر کھلتے چلے جائیں
اک سانس نہ لوں یونہی سفر کرتا چلا جاؤں

خاروں کی ضیافت کا تو سامان کیا ہے
صحرا کے لب خشک بھی تر کرتا چلا جاؤں

یاورؔ شبِ ہجراں مجھے ڈھونڈے گی کہاں تک
ہر موڑ کو منزل کی خبر کرتا چلا جاؤں

☆

ترے خرامِ خوش آثار کو، ترے قد کو
علوئے حیرتِ سیارگاں سلام کرے

☆

دل سے دھڑکنیں گئیں آنکھ سے نظر گئی
جلوہ گاہِ حسن میں سانس بھی ٹھہر گئی

آبجوئے وقت میں دور تک اُتر گئی
لَو مرے چراغ کی میرا کام کر گئی

شور مچ گیا تمام انقلاب آ گیا
آج مجھ کو دیکھ کر روشنی ٹھہر گئی

سوچتے ہی رہ گئے رہ گزر کی مشکلیں
بات کرتے کرتے ہی زندگی گزر گئی

کون سا دیار ہے کس کی رہ گزار ہے
ساتھ میرا چھوڑ کر خواہش سفر گئی

راہ دیکھتے ہوئے آنکھ لگ گئی تھی بس
جس کا انتظار تھا وہ گھڑی گزر گئی

کیوں ہوئے ہیں ہم سفر حیرتوں کے قافلے
کیوں نظارے چل پڑے ناؤ کیوں ٹھہر گئی

شب کو پیچھے چھوڑ کر گھر سے میں نکل پڑا
میرے ساتھ دور تک موجۂ سحر گئی

بے غلافِ رنگ و بو پھر وہی ہے دشتِ ھو
جسم اپنے گھر گیا جان اپنے گھر گئی

بے حدود و بے کراں دشت کائنات میں
کچھ نہ تھا مرے سوا جس طرف نظر گئی

جہاں بھی پاؤں پڑے پھوٹنے لگیں کرنیں
اک آفتاب کئی ماہتاب چھوڑ گیا

☆

شہر میں جو کائناتِ اہل نظر ہے
بے در و دیوار و بام میرا ہی گھر ہے

تیرے لئے اس طرف زیاں کا سفر ہے
برگ سر راہ آگے رقص شرر ہے

ایک طرف کھائی ایک سمت ہے کہسار
کتنا مشکل یہ خواہشوں کا سفر ہے

میں کہ امیر زمن غنی زماں ہوں
میرا اثاثہ کسی کی ایک نظر ہے

پھول کلی رنگ و بو فضائے خوش آثار
سب کا ہدف میں ہوں میرا دیدۂ تر ہے

رخ بھی بدلنے سے قافلہ نہ بچے گا
ریگ رواں ہے کہ آئینوں کا بھنور ہے

ہم سے بظاہر وہ گفتگو میں ہے مصروف
محورِ فکر و خیال بزم دگر ہے

اس کی جبیں کی چمک بتاتی ہے یاورؔ
دامن دل میں ابھی متاعِ گہر ہے

☆

کس نے منظر پر سیاہی پھیر دی
زندگی کے رنگ بھرتے ہی نہیں

☆

اک اضطرابِ مسلسل شبابِ دریا ہے
نہ جانے کس کی طرف روئے آب دریا ہے

ہر اک نگاہِ تجسس میں خوابِ دریا ہے
عجیب گنج گراں زیرِ آب دریا ہے

یہ آب وتاب، یہ مواجیاں، یہ عالم شور
شناوری کا جنوں ہی جوابِ دریا ہے

بس ایک موج مٹادے گی عکس ونقش وجود
زمین کیا ہے فقط اک حبابِ دریا ہے

خوشا کہ موجِ دلاویز نے قدم چومے
خوشا وجود مرا انتخابِ دریا ہے

سماعتوں پہ ہے طاری سرور کا عالم
بہت حسین صدائے ربابِ دریا ہے

شرارِ تشنہ لبی کو خبر نہیں شاید
جو سامنے ہے وہ موجِ سرابِ دریا ہے

نوائے کن ورقِ انتساب ہے یاورؔ
پھر اس کے بعد ہے جو کچھ کتابِ دریا ہے

☆

سیر گلزار میں وہ میری طرف سے گزرے
دفعتاً میں روش گل پہ نچھاور ہوجاؤں

☆

یوں تو دیکھنے میں تھا ابرِ کوہسار میں
خاکِ تشنہ پر گرا بن کر آبشار میں

جب سمندِ تیز رَو پر ہوا سوار میں
روندتا چلا گیا دشت و کوہسار میں

مدتوں سے منتظر ہوں سحابِ آب کا
جسم پر لپیٹ کر چادرِ غبار میں

شاخِ نازکی پہ وہ اک کھلے گلاب سا
گرد سے اَٹا ہوا سنگِ رہگزار میں

زیبؔ داستاں ہوا آخرش یہ واقعہ
سرخروئی پا گیا ہو کے سنگسار میں

یاورؔ ایک موجِ فن پارہ پارہ کر گئی
کب ہوا شناورِ بحرِ بے کنار میں

☆

دشت کے دشت ہیں چھانے میرے
ہر جگہ ثبت نشانے میرے

سنگریزے ہیں تری یادوں کے
میرے غم خوار یگانے میرے

کیوں مجھے نشّۂ بیداری ہے
خواب ہی کچھ ہیں سہانے میرے

تیر چھوٹے گا فضا میں میرا
آ گئے زد پہ نشانے میرے

مجھ کو پھیلا دیا صحرا صحرا
بال و پر لے کے ہوا نے میرے

پھیل جائیں گے ہوا کی مانند
ساری دنیا میں ترانے میرے

سر پہ دو سینگ کوئی اے یاورؔ
آج آیا ہے اُگانے میرے

☆

بستر ، نہ سکوں ، نہ خواب مجھ کو
دے تحفۂ اضطراب مجھ کو

کیوں لائقِ اعتنا نہ سمجھا
اِس بار بھی سیلِ آب مجھ کو

شیشے سے کیا سوال میں نے
پتھر نے دیا جواب مجھ کو

آوارہ ہوائیں دے گئی ہیں
اک سادہ ورق کتاب مجھ کو

رکھ دے گی اُداس مقبرے میں
بے منظریِ چناب مجھ کو

دے کر وہ رفاقتیں زمیں کی
بخشے گا اک آفتاب مجھ کو

تھا کوئی عبادتوں میں مصروف
اور ملتا رہا ثواب مجھ کو

بوسیدہ کتاب دی تھی اُس نے
پڑھنا تھا نیا نصاب مجھ کو

دیتے ہیں گزرتے لمحے یاورؔ
ہر لمحہ نیا خطاب مجھ کو

☆

بجھ چکی وہ آگ جو روشن ہوئی تھی
ہاں مگر زندہ ہے اک شعلہ ابھی تک

☆

مجھ میں ایک سمندر ہے
پانی جس کا گھر گھر ہے

تیشۂ فن میں رکھتا ہوں
دستِ خلا میں پتھر ہے

تنہا میری ذات ہے اور
گردابوں کا لشکر ہے

روشن جس سے وادیٔ جاں
شعلہ وہ میرے اندر ہے

جس نے مجھ کو سینچا تھا
اب وہ زمیں کے اندر ہے

دیکھنے میں ہے برگِ گلاب
اندر اندر پتھر ہے

چاٹ رہا ہے اس کا لہو
کتنا پیاسا خنجر ہے

یاورؔ یہ شور شرابا
خاموشی سے بہتر ہے

بھٹک بھٹک کے سر دشت زندگی یہ کھلا
خیال یار کی شاخیں ہیں سایہ دار بہت

☆

وہ بارشیں ہوئیں شمس و قمر نظر نہیں آئے
مگر شجر میں ہی اب کے گل و ثمر نہیں آئے

انا پسند تھے شاید مرے پرندے بھی
بھری اُڑان کچھ ایسی کہ لوٹ کر نہیں آئے

ہر ایک سمت سے تھیں سنگ باریاں لیکن
پلٹ کے دیکھا تو پتھر کہیں نظر نہیں آئے

تمام دشتِ بلاخیز اپنا بستر ہے
گزار لی کہیں باہر جو رات گھر نہیں آئے

پسِ دریچۂ شب چیختے ہیں اندیشے
ابھی پرندۂ خوابِ سحر کے پر نہیں آئے

بڑھا میں جس قدر اتنا ہی دور ہوتے گئے
مرے قریب کبھی میرے بام و در نہیں آئے

کہیں سے پارۂ سنگِ سفید اٹھا لایا
جو اُس کی دسترسِ شوق میں گہر نہیں آئے

جنہیں تھی جستجوئے برگ و بار اے یاورؔ
وہ بے لباسیٔ اشجار دیکھ کر نہیں آئے

☆

مرے دماغ کو میرے خدائے صنعت سے
ملی ہے قوت تخلیق شاہکار بہت

☆

موج کو تلوار دریا کو سپر کرتا ہوں میں
دشتِ آتش ناک کو زیر و زبر کرتا ہوں میں

کچھ چراغوں کی لویں رہتی ہیں میرے اردگرد
جب کسی تاریک جنگل کا سفر کرتا ہوں میں

طشتِ جاں میں گھولتا ہوں تیرہ و تاریک رنگ
اور پھر آمیزشِ رنگِ سحر کرتا ہوں میں

بارشیں دھو دیتی ہیں میرے سبھی نقش و نگار
جب کبھی آرائشِ دیوار و در کرتا ہوں میں

میرے ہمراہی ہیں یاورؔ کچھ بگولے کچھ سراب
بے نشاں بے سمت منزل کا سفر کرتا ہوں میں

☆

سیاہ رات کو روشن سحر اُسی سے ملی
کہ بحرِ چشم کو فصلِ گہر اُسی سے ملی

دبا ہوا تھا مرے محبس بدن میں کہیں
شرر کو پہلے پہل رہ گزر اُسی سے ملی

وہ ایسے زاویئے سے محو استراحت تھا
کہ آفتاب کی پہلی نظر اُسی سے ملی

وہ میرے لمس کا پیاسا تھا میں بھی کیا کرتا
اُسے شباہت شاخِ ثمر اُسی سے ملی

نجانے کیسی کشش تھی کہ ساعتِ خوش رنگ
مرے قریب بھی آئی مگر اُسی سے ملی

وہ آفتاب کی صورت اُتر گیا مجھ میں
مرے بدن کو بھری دوپہر اُسی سے ملی

اُسی سے مجھ کو ملی منزلِ سحر یاورؔ
مسافت شب تاریک تر اُسی سے ملی

☆

روشن و تابناک منظر ہے
کس قدر پُر تپاک منظر ہے

سوکھی شاخیں ہیں درمیاں حائل
مثلِ دل چاک چاک منظر ہے

کیوں نہ ہو اس میں گم وجود مرا
میں ہوں خاک اور خاک منظر ہے

چیختی پھر رہی ہے روحِ نبات
رات ہے ، خوفناک منظر ہے

زر فشاں ہر چراغِ حیرت میں
شہر روشن کا پاک منظر ہے

اک شرر بھی کہیں چمکتا نہیں
ہر طرف راک راک منظر ہے

میں ہوں اور محبسِ نوا یاورؔ
وہ ہے اور خوابناک منظر ہے

☆

زنبیل میں اک دعا نہیں ہے
کشکول ابھی بھرا نہیں ہے

اٹھتا ہے غبارِ دشت وحشت
گزرا کوئی قافلہ نہیں ہے

چھوڑے جو میانِ خاک و افلاک
ایسا تو مرا خدا نہیں ہے

ہر شخص کا سائباں ہو کیسے
وہ زلف کوئی ردا نہیں ہے

کیسا ہے مزاج پتھروں کا
ملتا کوئی نقشِ پا نہیں ہے

آئے گا گرفت میں ہماری
بندہ ہے وہ خدا نہیں ہے

تحریر ورق ورق ہے یہ بات
تجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

راہی بھی نڈھال ہے تھکن سے
جنگل بھی ہرا بھرا نہیں ہے

ہر شاخِ ثمر ہے دسترس میں
لیکن یہ شجر مرا نہیں ہے

خاموش فضاؤں کا ہے مسکن
جنگل یہ بے صدا نہیں ہے

لگتا ہے گلاب کا ہی پودا
حالانکہ گلاب کا نہیں ہے

اے موسمِ جاں نواز رُک جا
میرا دل ابھی بھرا نہیں ہے

کس گوشۂ ظاہر و نہاں میں
روشن ترا نقشِ پا نہیں ہے

ہے وادیٔ سنگ زار یاورؔ
یہ وادیٔ آئنہ نہیں ہے

☆

نشانِ پا پہ رکھی تھی نہ سنگِ در پہ رکھی تھی
سفر کی خواہشِ سفاک میرے سر پہ رکھی تھی

ہیولے تیرگی کے دم بخود تھے ایک گوشے میں
اُجالے رقص میں تھے روشنی بستر پہ رکھی تھی

جگایا جس کی ٹھوکر نے مری خوابیدہ آنکھوں کو
متاعِ کامرانی بھی اُسی پتھر پہ رکھی تھی

شکستہ ہو چکا تھا گھر مگر وہ ساعت روشن
ستون و گنبد و محراب و بام و در پہ رکھی تھی

صدا انداز تھے رخسار پر کچھ شبنمی شعلے
مگر فصلِ گہر بھی اُس کی چشمِ تر پہ رکھی تھی

فلک قامت کوئی کہسار میرے سر پہ رکھا تھا
ہوا کی آبشاری شعلۂ منظر پہ رکھی تھی

سیہ پوشوں کا لشکر لے رہا تھا مجھ کو نرغے میں
نظر میری لہو میں ڈوبتے پتھر پہ رکھی تھی

بجھا تھا شعلۂ گل ، سیلِ نظارہ تھا نم دیدہ
نفس کی بے ثباتی ہر کفِ منظر پہ رکھی تھی

اُفق روشن تھے پروازِ تخیل کے مگر یاورؔ
عجب وہ آگ تھی جو بازو و شہپر پہ رکھی تھی

☆

کل خواب کے کینوس پر اک شخص
اُترا تھا تصورات جیسا

☆

شکست و ریخت سے دوچار ہو رہا ہوں میں
مکانِ بے در و دیوار ہو رہا ہوں میں

بچھا رہا ہوں میں دلدل خود اپنے رستے میں
خود اپنی راہ کی دیوار ہو رہا ہوں میں

ہوائیں کھیلیں گی خاکسترِ بدن سے مری
کہ نذرِ آتشِ افکار ہو رہا ہوں میں

بدن اتار رہا ہوں اب اپنے شانوں سے
سفر کے واسطے تیار ہو رہا ہوں میں

سنوں ہر ایک بُنِ مؤ سے داستاں اپنی
ز فرق تا قدم اظہار ہو رہا ہوں میں

اُلجھ رہا ہوں خود اپنی نوائے حیراں سے
خود اپنی ذات سے بیزار ہو رہا ہوں میں

پہنچ رہا ہے ضرر بادگشت گشت سے بھی
مگر ہے یہ بھی کہ تہہ دار ہو رہا ہوں میں

لپٹ گئی ہیں دم توڑتی ہوئی کرنیں
اندھیرے کہتے ہیں ضوبار ہو رہا ہوں میں

مرا ہنر نہیں یاورؔ امینِ بے ہنری
بدلتے وقت کا معیار ہو رہا ہوں میں

☆

بے تعلق سی کھڑی دشتِ تعلق کے قریب
منظرِ سود و زیاں دیکھ رہی ہے دیوار

☆

نغمہ سرا ہے منظرِ دشت و لب جُو بھی
تیر رہی ہے میرے ساتھ اک خوشبو بھی

عدل بھی اُس کا، ہم بھی اُس کے اور تو بھی
بانٹ بھی اُس کے ہیں اُس کا ہے ترازو بھی

میری نگاہیں دیکھتی ہیں سب پست و فراز
آجا میرا ہاتھ پکڑ لے ، آ تو بھی

گیا زمانہ جب ہم ہی کرتے تھے شکار
جال بچھائے بیٹھے ہیں اب آہو بھی

ویرانی ہی نہیں ہے آنکھوں میں بیٹھی
سما گیا ہے مجھ میں آسیبِ ہُو بھی

میں بھی سر پھوڑ رہا تھا اک شیشے سے
سنگِ ہزیمت سے برسوں اُلجھا تو بھی

موجِ نظارہ بھی ہے محو خواب کہیں
ساکت و جامد ہے عالم رنگ و بُو بھی

ارد گرد کے منظر ہی نہیں بدلے ہیں
بدل گئی ہے کچھ یاور میری خُو بھی

☆

جب نہ ہونگے مہ و خورشید نہ جگنو نہ چراغ
کام آئے گا بہت رنگ حنا رات گئے

☆

دھوپ کا تھا ہمسایہ میں
کب تک آخر بچتا میں

اپنی بھی مجھ کو خبر نہیں
جانے کہاں ہوں کھویا میں

ڈھونڈ رہی ہے کس کو ماں؟
میں ہوں تیرا بیٹا ، میں

کہاں گیا وہ دستِ شفیق
جس کا ہوں سرمایہ میں

مجھ سے دریا بہتے ہیں
پھر بھی تشنہ تشنہ میں

زخم پرانے ہو چکے تھے
کب تک ڈھوتا رہتا میں

سامنے میرے کچھ بھی نہیں
سوچ رہا ہوں کیا کیا میں

چلتے چلتے راہ اپنی
بھول گیا ہوں رستہ میں

سب ہی مجھ کو جانتے تھے
بھیڑ سے کیسے نکلتا میں

اوڑھ کے یاورؔ بے طلبی
دشتِ طلب سے نکلا میں

☆

مجھ کو عجب نگاہ سے دیکھا گُلِ بہار نے
دوڑ پڑے مرے رفیق میری نظر اُتارنے

کوئی کلی نہیں رہی شاخ ہری نہیں رہی
اب کے خزاں کے سب ریکارڈ توڑ دیئے بہار نے

پارۂ ابر کی طرح دشت بہ دشت میں پھرا
اُس کا پتہ دیا مجھے اُڑتے ہوئے غبار نے

حرف و نوا کی شاخ پر دفترِ گفتگو کُھلا
توڑ دیا سکوتِ شب منظرِ کوہسار نے

تیر و سناں کی ضرب سے آنکھ نہ کُھل سکی مری
اور جگا دیا مجھے ایک چبھن سے خار نے

دیکھ کے مجھ کو سرخرو جھوم اُٹھا مرا عدو
اُس کو شکستِ فاش دی جب مرے شہسوار نے

جب نہ ہدف پہ جا سکا جب نہ سکون پا سکا
مجھ کو مکاں بنا لیا شعلۂ بے قرار نے

خود تو نہ کچھ کیا مگر ردِ عمل کی آگ سے
شہر جلا دیا تمام ننھے سے اک شرار نے

قطرۂ اشک نے کیا چہرے پہ اُس کے جب قیام
آئے مصورانِ غم اپنے ہنر نثار نے

حسنِ جہاں بھی پُرکشش تھا تو بہت مگر مجھے
فرصتِ دید ہی نہ دی عشق کے کاروبار نے

☆

پھرتا عبث ہے کیوں کوٗ بہ کوٗ تو
مجھ میں سمٹ جا اے عالمِ ہوٗ

خورشید غم کا آیا جو سر پر
بکھرائے اُس کی یادوں نے گیسو

ہمراہ میرے کیوں چل رہا ہے
جب میں نہیں ہوں تو کون ہے تو

یوں بس گیا ہے وہ میرے اندر
جیسے بسی ہو پھولوں میں خوشبو

اک دوسرے کو تکتے ہیں پیہم
اک دشت، اک میں، اور ایک آہو

جوشِ جنوں اب بیدار ہوجا
دشتِ بدن میں چلنے لگی لو

اچھا نہیں ہے باہر کا موسم
اے شعلۂ غم بجھ جائیگا تو

یوں سر بہ کف ہیں افکار مجھ میں
جنگل میں جیسے پھرتا ہے آہو

اب میری جانب وہ آ رہا ہے
یہ ہے حقیقت یا کوئی جادو

☆

قلم سے کاغذ کی سرحدوں پر نئے مضامیں اُتر رہے ہیں
میں اُس کے چہرے کی روشنی میں کتاب تحریر کر رہا ہوں

☆

ہوگئی دفن تموج کا مقدر اوڑھے
ہائے وہ مست ندی جس نے سمندر اوڑھے

دے نہ دیں تُند ہوائیں یہ عقابوں کو خبر
غول کا غول پرندوں کا ہے شہپر اوڑھے

کہیں پربت سی بلندی کہیں خوشرنگ ڈھلان
ایک صورت ہے کئی طرح کے پیکر اوڑھے

بسترِ خاک پر اک شخص ہم آغوش اُمید
سر کو تکیہ کئے اور اپنا مقدر اوڑھے

میں نے جب رختِ سفر باندھ لیا اے یاورؔ
میری ہمت بھی چلی عزم کی چادر اوڑھے

☆

ہوئی جو بارشِ غم آنکھ پھیرلی کیسی
اِن آستین کے سانپوں سے دوستی کیسی

کھُلی فضاؤں میں آؤ خنک ہوا سے ملو
تلاش کرتے ہو کمرے میں تازگی کیسی

جمالِ یار تہوں میں اُتر گیا شاید
سیاہ جھیل کے اندر ہے روشنی کیسی

چھپا ہوا ہے نظر سے ابھی خزانہ کوئی
کھڑی ہوئی ہے یہ دیوارِ آگہی کیسی

ہزاروں چیختی چنگھاڑتی سی آوازیں
ہراس و خوف کے صحرا میں زندگی کیسی

دبا ہے گردِ مہ و سال میں بدن یاورؔ
نکل رہی ہے پھر آنکھوں سے روشنی کیسی

☆

اوڑھ کے کالی چادر مَیں
جھانک رہا ہوں گھر گھر میں

جسم پہ میرا قبضہ ہے
رینگ رہا ہوں سر پر میں

چیروں سمندر کا سینہ
ڈھونڈوں اپنا گوہر میں

باہر دستک دیتا ہوں
بیٹھا گھر کے اندر میں

پھول ہے تُو اور میں خوشبو
وادی تیری منظر میں

جتنا باہر دِکھتا ہوں
اُتنا ہی ہوں اندر میں

اپنے سر پر خود یاورؔ
مار رہا ہوں پتھر میں

☆

ایک بچہ خاک میں غلطاں کہیں
ماں کی ممتا ششدر و حیراں کہیں

خوابِ گیتی کو بھی اب محتاج ہیں
خاک میں سوئے ہوئے سلطاں کہیں

سبز لمحے آ گئے زیر اثر
دشت کو حاصل ہوا عرفاں کہیں

نوکِ خنجر بن کے اُترے گی کرن
چاک ہوگا تیرہ تر داماں کہیں

رفعتیں اس میں ہی تھیں پنہاں مگر
در بہ در بھٹکا کیا ناداں کہیں

ہاتھ خالی آ گیا یاورؔ یہاں
رہ گیا رستے میں ہی ساماں کہیں

☆

خوابیدہ منظروں کو جو بیدار کر گئے
وہ روز و شب کہاں ہیں وہ موسم کدھر گئے

روشن مرے لہو سے ہوئی رہگزر تمام
یہ آئینے تو ٹوٹ کے بھی کام کر گئے

جولانیوں کو دشت کی وسعت بھی چاہئے
دیوار و در جنوں کی نظر سے اتر گئے

اب ساعت عروج کہاں ہے خبر نہیں
دیکھے ہوئے بھی اس کو زمانے گزر گئے

کوئے جنوں میں پھینک دیا عشق نے مجھے
پتھر مری شناخت کا سامان کر گئے

کوئی افق کی شاخ پہ نغمہ سرا ہوا
اور خواب زادگان کے چہرے اتر گئے

تحریر کیا تھا اس کی جبیں پر کہ یک بیک
سب خواہشیں ہوا ہوئیں جذبات مر گئے

زندہ دلانِ شب سے کبھی مل لیا کرو
ایسا بھی کیا کہ رات ہوئی اور گھر گئے

اکثر گھر اپنے جاتے ہوئے آ گیا خیال
کچھ لوگ تھے جو بے در و دیوار مر گئے

ماحول اب بھی گرم ہے لیکن یہ کیا ہوا
بزمِ سخن کو چھوڑ کے اہلِ نظر گئے

یاورؔ نفس کی آمد و شد ہوگئی محال
بادل دھویں کے، زہر رگ و پے میں بھر گئے

☆

رقصِ گردابِ ماہ و سال میں ہوں
قید اپنے بنائے جال میں ہوں

فکر ماضی میں ہوں نہ حال میں ہوں
مطمئن حجرۂ کمال میں ہوں

در بہ در ٹھوکریں نہ کھاتا پھر
میں ترے دست بے سوال میں ہوں

ایک لمحہ رہائی دے گا مجھے
قید اک ساعتِ زوال میں ہوں

خاک میں مل چکا وجود مرا
پھر بھی موجود اپنی آل میں ہوں

میں نہ ہوتا تو بجھ گیا ہوتا
خیمہ زن شعلۂ جمال میں ہوں

مجھ پہ تنقید مت کر اے یاورؔ
میں ہوں جیسا بھی اپنے حال میں ہوں

☆

مشتعل شعلۂ سفاک ہوا چاہتا ہے
خرمن حرف و نوا خاک ہوا چاہتا ہے

صبر کر دشت غزالاں کہ بہت دیر نہیں
بس رواں دیدۂ نمناک ہوا چاہتا ہے

اوس کی بوند بھی جسم اپنا چراتی ہے بہت
دست خورشید بھی بے باک ہوا چاہتا ہے

کب اسے حرفِ تمنا کا ہوا ہے ادراک
جب مرے دل کا مکاں راک ہوا چاہتا ہے

ابر نیساں کا ہوا کوئے نوازش میں پڑاؤ
مطلع بطن صدف چاک ہوا چاہتا ہے

آسماں خاک بسر پھرتے ہیں قریہ قریہ
رونما مرکز لولاک ہوا چاہتا ہے

شاخِ گل چومنے والی ہے لب جوئے رواں
آب مشروب رگِ تاک ہوا چاہتا ہے

خامشی لب پہ بٹھانے لگی پہرے یاورؔ
اب اُسے عشق کا ادراک ہوا چاہتا ہے

بام ودر ومحراب سب گونگے ہوئے
سر پھوڑتا ہے کیوں صداؤں کی طرح

☆

سمندر آ گیا عاجز گرانی سے
رہائی کون دے گا اس کو پانی سے

لئے دل میں حروف و لفظ کا مخزن
الجھتا ہوں میں اکثر بے زبانی سے

بہت کام آیا جست و خیز سے رشتہ
نکل آیا مَیں سیلِ بے کرانی سے

چراغ اپنے نہیں بجھنے دیئے میں نے
بچا لایا ہوا کی پاسبانی سے

درِ تکمیل پر ہی جا کے ٹھہرے گا
نہ بولو ناقۂ تسبیح خوانی سے

لکھا ہے اقتباسِ زندگی اُس نے
خیال و خواب پر مبنی کہانی سے

سفر گم گشتہ ساعت کا ہوا آساں
مرے ٹوٹے پروں کی سائبانی سے

ملا کرتا تھا یاور گاہے گاہے میں
جنابِ حرفِ حق خلد آشیانی سے

لہو میں تر بہ تر دیکھے ہیں منظر
دریچے جب بھی ماضی کے کھلے ہیں

☆

کسی کی آمد و شد ہے یہاں مکیں کوئی ہے
کھنڈر یہ اتنا بھی ویراں نہیں کہیں کوئی ہے

چھڑی ہے آج بھی وہم و یقیں کے بیچ یہ جنگ
کوئی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں، نہیں کوئی ہے

کبھی خزاؤں کی آہٹ کبھی بہار کے رنگ
مرا وجود نہیں گوشۂ زمیں کوئی ہے

سکوتِ دشت سماعت کو توڑتے ہوئے حرف
صدائیں دیتا ہوا اک دلِ حزیں، کوئی ہے

ابھی تسلسل پرواز کے قدم نہ رکیں
اس آسمان سے آگے بھی شہ نشیں کوئی ہے

دریچے کھلتے رہے ، کاروبار ہوتا رہا
صدا لگاتے رہے خنجر ، آستیں کوئی ہے

نم سحابِ کرم نے یہ انکشاف کیا
کہ میرے زیرِ قدم دشتِ آتشیں کوئی ہے

مرے خیال کی رَو نے خبر یہ دی ہے مجھے
جہاں نہیں ہے کسی کا نشاں وہیں کوئی ہے

رواں یونہی تو نہیں جوئے نرمیٔ گفتار
سخن طراز پسِ پردہ مہ جبیں کوئی ہے

مرے جنوں مری وحشت پہ خندہ زن یاورؔ
ہے ماہتابِ شبِ غم کہ نکتہ چیں کوئی ہے

☆

گریۂ شب کا مرے اشک فشانی کا مری
دستکیں مرکز و محور ہے کہانی کا مری

وقت پر بھی مرے دروازے رہے بند سدا
کون پوچھے گا سبب نقل مکانی کا مری

آتش گل ہی نہیں سینۂ خورشید کے ساتھ
اک ثبوت اور بھی ہے شعلہ بیانی کا مری

کوئی دن ایسا نہیں جب نہ مرے پاس آئے
مجھ سے یہ کیسا تعلق ہے نشانی کا مری

ظرفِ لبریز کے نشّے میں تھا سرشار بہت
انتظار اب ہے سمندر کو روانی کا مری

میں بھی بے پیکر و بے رنگ تھا کیا کرتی ہوا
وار خالی ہی گیا دشمن جانی کا مری

داستاں بن کے سر صفحۂ دل اے یاورؔ
مجھ میں زندہ ہے ہر اک گوشہ جوانی کا مری

☆

نظارگی کا شوق مِلا چشم وا مِلی
پھر بے لباسیوں کی بدن کو قبا مِلی

سیل جنوں نے راستہ اپنا بدل لیا
وہ آگہی کی گرد سرِ آئنا ملی

کس نے چمن کو گنبد بے در بنا دیا
سر پتھروں سے پھوڑتی بادِ صبا ملی

زنجیر نقش پا نے اُسے قید کر لیا
بہر سفر جو مرضیٔ آب و ہوا ملی

جب بھی کوئی سوال مرے روبرو ہوا
بجلی سی اک تڑپتی مجھے زیر پا ملی

آخر فصیلِ وقت زمیں بوس ہوگئی
ہر چند شہپروں کو مخالف ہوا ملی

بھیگے جو میرے ہونٹ سوالِ وصال سے
دریا کی قید ، تشنہ لبی کی سزا ملی

چہرے کے سارے رنگ چھلکتے ہوئے مِلے
شاخِ نظر پہ بلبلِ باغِ صدا مِلی

یہ کس طلسم زار میں اُس نے کیا اسیر
آوارگی مزاج کی بے دست و پا ملی

جب زاویہ بلند ہوا کچھ نگاہ کا
اس کی صدا ہواؤں میں نغمہ سرا ملی

خوشبو چمک رہی تھی نہ یاورؔ مہ و نجوم
لاسمتیت میانِ سفر رہنما مِلی

☆

حیات اوسان اپنے کھو رہی ہے
شکاری آنکھ روشن ہو رہی ہے

ہماری بستیوں کا قتل کرکے
ندی دریا میں دامن دھو رہی ہے

تبسم کے فرشتے رقص میں ہیں
کلی آغوشِ گل میں سو رہی ہے

ہوا کے پاؤں میں پتھر بندھے ہیں
زمیں بس بوجھ اپنا ڈھو رہی ہے

دریچے اشک بن کر بہہ رہے ہیں
کھنڈر چپ ہیں حویلی سو رہی ہے

میں اپنا گھر مقفل کر رہا ہوں
کسی کو کیوں ندامت ہو رہی ہے

چراغوں سے ملی فرصت تو اب وہ
سرِ صحرا بگولے بو رہی ہے

ہم اپنے پیش و پس سے بے خبر تھے
ہماری فکر اوروں کو رہی ہے

کئی دن کی تھکی ہاری ہوئی رات
کسی کسبی کی صورت سو رہی ہے

اب اوڑھے ہے ردائے زہرناکی
ہر اک ساعت کبھی خوش گو رہی ہے

ملاقات اس سے ہوتی کیسے یاورؔ
مری دشمن قیامت جو رہی ہے

☆

زخم کھائے ہیں بہت نام ونسب سے ہم نے
حرف یہ کاٹ دیئے محضر لب سے ہم نے

دل کی بستی میں کوئی شورش و ہنگامہ نہ تھا
کچھ شرر مانگ لئے اُسکے غضب سے ہم نے

آگ پر پھول گرا، دشت پہ برسے بادل
جو بھی کہنا تھا ہمیں، کہہ دیا سب سے ہم نے

در پہ دستک کی ندامت سے بچایا خود کو
کرلیا اُس کو طلب اپنی طلب سے ہم نے

پاس آیا تو کھُلا، تھا وہ نگاہوں کا فریب
زخم وا کر لئے سب جس کے سبب سے ہم نے

اپنے ہمزاد کو مامورِ ستم ہم نے کیا
خود پہ سو وار کئے روز عقب سے ہم نے

خال و خد کر لئے محفوظ خدا جانتا ہے
گھوم کر دیکھا نہیں آئینہ کب سے ہم نے

صبر کے جتنے صحیفے تھے ، کئے دریا برد
لب لگا ہی دیئے تصویر کے لب سے ہم نے

آنکھ کھولی ہے دریچوں نے تو آیا ہے خیال
گھر کے دروازے بھی کھولے نہیں کب سے ہم نے

موسم آواز لگاتے رہے لیکن یاورؔ
سر نکالا نہیں مٹی کے عقب سے ہم نے

☆

پشت آئنہ جو ہے منحرف ہوا کرے
عکس اپنی ذات میں منکشف ہوا کرے

ہم بھی ہوں چراغ بھی روشنی بھی داغ بھی
ہر صفت سے انجمن متصف ہوا کرے

سیر دشت و در کرے برگ خشک کی طرح
سنگ بھی ہواؤں کا معترف ہوا کرے

روزنِ خیال سے چاند کا ہو جب گزر
لمحۂ ثبات میں معتکف ہوا کرے

میرا ہی وجود ہے کائناتِ انجذاب
میری سمت شعلگی منعطف ہوا کرے

کب تلک خزاؤں کے حوصلے رہیں بلند
برگ اگر نہ شاخ سے منصرف ہوا کرے

کروٹیں نئی نئی لے گا آئینہ مگر
دیکھنے کا زاویہ مختلف ہوا کرے

☆

آغوشِ نظر میں اس کا دل ہے
یا قطرۂ خونِ مشتعل ہے

تخلیق گریز پا سے اپنی
اک دست کمال منفعل ہے

آیا نہ گرفت میں کسی کی
عنقا مرے دام میں خجل ہے

انگارۂ غنچۂ دہن سے
خورشید فلک ہمارا دل ہے

دیکھا تھا گل شراب پیکر
طاری وہی نشّہ مستقل ہے

صدیوں کی ہے تشنگی لبوں پر
پانی ہے برف ، برف سل ہے

ہے سحر کشا کی آمد آمد
نیرنگ طلسم مضمحل ہے

کس گل نے کیا قیام یاورؔ
مہتاب جہاں مکانِ گل ہے

☆

جلنے راکھ ہونے کا حوصلہ ہے مجھ میں بھی
میں بھی آج دیکھوں گا شعلۂ شباب اُس کا

☆

برق جاں، برق صفت، برق نظر بھی ہونگے
دسترس میں خس وخاشاک کے گھر بھی ہونگے

آگ کے پھول شعاعوں کے شجر بھی ہونگے
کف قرطاس پہ کچھ نقش دگر بھی ہونگے

گھر سے نکلا تو کہیں سے یہ صدا آئی تھی
یہی نظارے سرِ راہگزر بھی ہونگے

آشیانہ مری شاخوں پہ بنالیں بھی تو کیا
یہ مہاجر کبھی مصروفِ سفر بھی ہونگے

گھر کی تزئین میں تھوڑی سی کمی رہنے دے
آنے والوں میں کئی اہل نظر بھی ہونگے

منتظر بیٹھی ہیں ویرانیاں دیواروں میں
یہ مکاں ایک نہ اک روز کھنڈر بھی ہونگے

انہیں اطراف سے آتی ہے صدائے گریہ
انہیں اطراف میں خوابوں کے نگر بھی ہونگے

میرے خم خانۂ احساس کو پامال نہ کر
اسی مٹی میں ترے خاک بسر مجھی ہونگے

قیس و فرہاد نے یاورؔ کبھی سوچا ہوگا
آبلہ پائی کے انداز دگر بھی ہونگے

☆

میں خلائے بیکراں کی وسعتوں میں گم تھا جب
میرا پیچھا کر رہی تھی اک صدائے بازگشت

☆

چھوڑ دیتا ہے ترا ساتھ جہاں چاہتا ہے
آئنہ تجھ کو مری طرح کہاں چاہتا ہے

مستقل ساتھ رہا کرتا ہے سائے کی طرح
کس قدر میرے چراغوں کو دھواں چاہتا ہے

سوچتا ہوں کہ یہ ایثار بھی کر ہی بیٹھوں
ایک سورج مری مٹی میں مکاں چاہتا ہے

خود ہی رشتوں کی رگیں توڑ کے وہ برگ مراد
پھر کف شاخ تمنا پہ اماں چاہتا ہے

آتے جاتے ہوئے چہروں سے بہلتا ہی نہیں
وہ دریچہ تو متاعِ دل و جاں چاہتا ہے

قید زنجیر طلسمات میں شب بھر رکھا
قصہ خواں اب صلۂ سحر بیاں چاہتا ہے

وا ہو آشفتہ سروں پر ہی درِ کوچۂ درد
کس لئے وقت کا ہر شخص زیاں چاہتا ہے

اس طرف ہجر کا موسم ہے خوش آیند بہت
دل رہائش پس دیوارِ گماں چاہتا ہے

ہاتھ میرے بھی اُسی گل کے تمنائی ہیں
وہ بھی یاور کوئی دستِ نگراں چاہتا ہے

کیسے پہچانے مجھے کوئی شناسا میرا
شہر کی بھیڑ میں گم ہو گیا چہرا میرا

☆

چپ ہوا ، ترشیٔ گفتار کہاں ختم ہوئی
ختم ہونے پہ بھی دیوار کہاں ختم ہوئی

ہم بھی کیا سادہ تھے کھاتے رہے خود سے ہی فریب
رونق کوچہ و بازار کہاں ختم ہوئی

اس بلندی پہ پہونچ کر بھی وہی پستی ہے
یہ تگ و دو بھی مرے یار کہاں ختم ہوئی

زرد ہونے پہ کھُلیں اور تکلم کی جہات
پھول کی خواہش اظہار کہاں ختم ہوئی

نئے سورج افق غم پہ نمودار ہوئے
تو مگر اے شب بیمار کہاں ختم ہوئی

لب ہوں خاموش تو ہر عضو بدن بولتا ہے
خواہش حرفِ شرربار کہاں ختم ہوئی

کتنے جذبوں کا لہو چاٹ چکا ہے یاورؔ
اس کے خنجر کی مگر دھار کہاں ختم ہوئی

☆

یہیں پہ ختم ہے بستی، مکان آخری ہے
مرے عروج طلب یہ جہان آخری ہے

فضا میں طائرِ شب کی اڑان آخری ہے
جو اب سناؤں گا وہ داستان آخری ہے

چلو کہ سرحدِ جاں سے گزر کے دیکھتے ہیں
وہ کہہ رہا ہے یہی امتحان آخری ہے

گمانِ حجرہ نشیں کو یقین ہو کہ نہ ہو
ہمارے واسطے اُس کی زبان آخری ہے

سفر کا مرحلۂ اولیں تمام ہوا
گزر گیا جو ابھی آسمان ، آخری ہے

یہی بچی ہے فقط یادگارِ شامِ وصال
اسے نہ توڑ کہ یہ پھول دان آخری ہے

کھُلے ہیں راستے یاورؔ نہ کوئی روک نہ ٹوک
کہ راہِ دشت میں یہ سائبان آخری ہے

☆

دل کو کچھ غم نہ کوئی کارِ دگر رہ گیا ہے
گھر سے نکلا تو سرِ راہ گزر رہ گیا ہے

میری آنکھوں میں چہکتے ہیں خدوخال اُس کے
اک پرندہ جو سرِ شاخِ قمر رہ گیا ہے

شوکتِ رفتہ و گزراں کا بیاں کرتا ہوا
نقشِ تعمیر فقط ایک کھنڈر رہ گیا ہے

ہر قدم مانگتا ہے راستہ چلنے کا خراج
میرا سب زادِ سفر تو وہیں پر رہ گیا ہے

شعلۂ درد کہاں چھوڑتا ہے کوئی شناخت
تو ہے خوش بخت ترا کاسۂ سر رہ گیا ہے

دونوں ہاتھوں سے ہوا خاک اُڑاتی ہے کیوں
کیا ابھی راکھ تلے کوئی شرر رہ گیا ہے

کیوں چراغوں کی لویں خوف سے تھرتھر کانپیں
آندھیوں میں ہی کہاں کوئی ہنر رہ گیا ہے

اپنے ہونٹوں کو مرے دیدۂ تر پر رکھ لے
تشنگی چند ہی سانسوں کا سفر رہ گیا ہے

دیمکیں چاٹ گئیں حرف سب اُس کے یاورؔ
میری تحویل میں بس مور کا پر رہ گیا ہے

میں اُسکے بارے میں پہروں سوچا کرتا ہوں
وہ بھی اکثر سوچتا ہوگا میرے بارے میں

☆

سنگ ساعت کی ضرب ایسی تھی
جسم محفوظ ، روح زخمی تھی

میری آنکھوں میں خواب جاگتے تھے
میرے بستر پہ رات سوتی تھی

بج رہا تھا کہیں رباب خرام
نغمگی کہکشاں سی بکھری تھی

طائر شاخِ شب تھا مہر بہ لب
آبجو چاندنی میں سوتی تھی

سبز اُسی سے ہے شعلۂ منظر
آنسوؤں نے جو فصل بوئی تھی

یاد آتے ہیں دھندلے دھندلے نقوش
زندگی اس کے ساتھ گزری تھی

قتل خورشید دیکھنے کے لئے
شام بامِ شفق سے اتری تھی

دم بخود تھے سب آئینے یاورؔ
میری چٹکی میں ایک تتلی تھی

اِسے بھی پھینک کے لے امتحاں سمندر کا
لئے ہے ہاتھ میں پتھر تو سوچتا کیا ہے

☆

دشمن جاں ہوئی سپاہ مری
خار و خس بن گئے پناہ مری

میں ہی کیوں دیکھتا رہوں تجھ کو
لے خبر تو بھی گاہ گاہ مری

ایک آئینہ ہے مرا مسکن
ایک آئینہ سیرگاہ مری

بجھے صحرا کی وحشتوں کے چراغ
دیکھ کر حالت تباہ مری

منکشف ہو رہے ہیں ارض و سما
اس کے قدموں پہ ہے نگاہ مری

تھا جداگانہ آج اس کا خرام
خوب اڑی خاکِ اشتباہ مری

شکل سبزے کی پا گئی یاورؔ
بام و در سے لپٹ کے آہ مری

☆

اس دور میں علم و فن سزا ہے
ہر آئینہ دار پر چڑھا ہے

اک آگ لگی ہوئی ہے ہرسو
گلزار کہیں کِھلا ہوا ہے

شعلوں میں گلاب کِھل رہے ہیں
دریا میں الاؤ جل رہا ہے

آنکھوں میں کبھی اتر کے دیکھو
مواج سمندروں میں کیا ہے

جس نے مجھے راستہ دکھایا
اب وہ مری راہ دیکھتا ہے

سبزے نے کئے ستارے روشن
خوشبو نے ترا پتہ دیا ہے

کہتا ہے مِلا ہے میرے گل سے
آئینہ بھی خواب دیکھتا ہے

پانی پہ تھرک رہی ہیں کرنیں
جنگل میں کوئی غزل سرا ہے

جب ہم نے قریب ہونا چاہا
اک حرف فصیل بن گیا ہے

آنکھوں سے ہیں آبشار جاری
ہر منظر تھرتھرا رہا ہے

دونوں ہی طرف قضا کی راہیں
دوراہے پر کوئی کھڑا ہے

کچھ تیرا آئنہ بھی بدلا
میرا چہرہ بھی کچھ نیا ہے

کیسی ہے کسک نواحِ دل میں
کانٹا سا کہیں کھٹک رہا ہے

بے سمت و نشاں سفر ہے یاورؔ
تارے ہیں نہ کوئی نقش پا ہے

☆

اُس نے اک پیکر خاکی میں اتارا کیا کیا
دیکھنے والوں نے دیکھا ہے نظارا کیا کیا

کوئی اک ہاتھ نہ امداد کو آگے آیا
بیچ دریا سے کیا میں نے اشارا کیا کیا

☆

برائے نام جہاں رہ گزر میں خاک نہیں
کشش مرے لئے ایسے سفر میں خاک نہیں

ہر ایک رخ سے دکھاتا ہے دشت آئینہ
عبث ہے رکنا کہ سایہ شجر میں خاک نہیں

ہوا کے دست ہنر کا کمال ہے ورنہ
مزاج شعلگی برگِ شجر میں خاک نہیں

زمین سے کوئی رشتہ نہیں ہے کیا میرا
میں لوٹتا ہوں مگر بال و پر میں خاک نہیں

کسی کا عکس چھپائے ہوئے ہے سینے میں
اک آئینہ ہے کف نامہ بر میں خاک نہیں

میں کیا کروں گا ترے ماہتاب کو لے کر
کہ زندگی کی رمق اس گہر میں خاک نہیں

مرا لباسِ خرد جس نے تار تار کیا
وہ ایک بات کسی کی نظر میں خاک نہیں

چمک رہے ہیں در و بام آئینے کی طرح
کہیں برائے تیمّم بھی گھر میں خاک نہیں

وہی ہنر ہے، وہی چاک ہے، وہی گردش
مگر شرارِ جنوں کوزہ گر میں خاک نہیں

سرشت ہجرت پیہم شناخت ہے یاورؔ
اثر جمود کا خاکِ سفر میں خاک نہیں

☆

جو چیز مثالی ہے مثالی ہی رہے گی
خوشبو ترے پیکر کی ہے عالی ہی رہے گی

آنکھوں میں تو رہتی ہیں کئی طرح کی آنکھیں
اس دل میں مگر چشم غزالی ہی رہے گی

مستور ہے اسرار کے پردے میں وہ جب تک
جو چشم تجسس ہے سوالی ہی رہے گی

شمشیر کو فرصت نہیں اظہارِ ہنر سے
ملبوس بدن خون کی لالی ہی رہے گی

وہ سامنے آجائے تو ہے دیکھنا مشکل
اس پھول کی تصویر خیالی ہی رہے گی

سمجھوں گا شراروں کو میں صد رنگ ستارے
شعلوں میں بھی یہ فکر جمالی ہی رہے گی

جب تک کہ تشفی کے دریچے نہ کھلیں گے
آواز کو بھی ضد ہے سوالی ہی رہے گی

تعمیر عمارات جنوں ہوتی چلی جائیں
بنیاد میں وہ چشم غزالی ہی رہے گی

تفصیل چمن ، حسن روش تا بہ روش ہے
اجمالِ چمن ، پھول کی ڈالی ہی رہے گی

ہونٹوں سے جھڑیں پھول کہ شعلوں کی ہو بارش
ہر طرزِ ادا اُس کی نرالی ہی رہے گی

دیکھ آؤ کبھی ارضِ فلسطین بھی یاورؔ
کیا خواہش دیدارِ منالی ہی رہے گی

☆

جو محو کلام مجھ سے ہوا مرا ہی ندیم تھا کہ نہ تھا
زباں سے مری ادا جو ہوا وہ حرف کلیم تھا کہ نہ تھا

وہ صورت گل تھا محو سفر یہ بات میں مانتا ہوں مگر
میں اس کے عقب میں صورت سیل موج شمیم تھا کہ نہ تھا

کسی کا خیال کاٹ رہا تھا ہجر کی ساعتیں کہ نہیں
چراغ کا نور بن کے مکاں میں کوئی مقیم تھا کہ نہ تھا

☆

دیکھتا کون کہ ہر شخص کی آنکھیں تھیں بند
بادِ لمحات اُڑا لے گئی ہم سے کتنے

☆

کشتی تو ہم بھنور کی حدوں سے گزار لائے
دریا اب اور کوئی نیا انتشار لائے

باد سموم خاک بہ سر پھرتی ہی رہی
ہم ایک پھول شاخِ نظر سے اتار لائے

آخر کھلا کہ خود سے نبرد آزما تھا میں
جب میرا سر ہی رن سے مرے شہسوار لائے

اک بات میں سنوں جو مجھے اعتبار ہو
اک بات میں کہوں وہ اگر اعتبار لائے

منظور ہے جو سنگ نوا دے تری خبر
موسم جراحتوں کا یونہی بار بار لائے

طوفانِ ابر و باد سے ہونے کو دوبدو
ہم بھی چراغ شوق سر رہ گزار لائے

پھر جستجو دکھائے گی راہِ جنوں ہمیں
یاور پھر آرزو کے شجر برگ و بار لائے

☆

دریا اک اختیار کا اظہار ہی تو ہے
صحرا کو کاٹتی ہوئی تلوار ہی تو ہے

یہ رات درمیان کی دیوار ہی تو ہے
اُس کی پناہ گاہ بس اُس پار ہی تو ہے

اُس کے لبوں سے میرے لئے جو ادا ہوا
وہ لفظ اُس نگاہ کا معیار ہی تو ہے

ذرے کی وسعتوں کو بنا لینا سیرگاہ
ناممکنات میں نہیں ، دشوار ہی تو ہے

ہم بھی اِسی سے فیض اٹھالیں تو حرج کیا
سورج چراغ قافلۂ یار ہی تو ہے

خاروں کی رہنمائی میں پہونچے ہیں کس طرح
پھولوں سے اس کا تذکرہ بیکار ہی تو ہے

سیلاب رنگ ہے کہ پیام نمود گل
خوشبو مرے غزال کا اظہار ہی تو ہے

اک نقش ناتمام ہے تصویر کائنات
حیرت ہے کیا طبیعت فنکار ہی تو ہے

اس سے بغیر گزرے خبر کیا ادھر کی دوں
کہسار کا یہ سایہ بھی کہسار ہی تو ہے

لپٹے ہیں جس کے پاؤں سے ارض و فلک تمام
یاور غلام احمد مختار ہی تو ہے

بیچ آنگن میں ایک ہیولا رات گئے
چیخ رہا ہے اک آسیبی پیکر سا

☆

قدم سنبھال کے رکھنا کہ دیکھتا بھی ہے
یہ سنگ راہ بھی ہے اور آئینہ بھی ہے

صدا لگانا بھی ہے ارتکاب جرم یہاں
اسی نواح میں گنجائش صدا بھی ہے

مرے لہو سے ہی گلکاریِ حیات نہیں
فسوں طراز تری تابش حنا بھی ہے

خزاں کی شاخ پہ کھلنا گل بہاراں کا
ہے ایک منظر دلکش بھی حادثہ بھی ہے

ادائے ابر گریزاں سے خوب واقف ہوں
ہزار بار اسے دیکھا بھی ہے سنا بھی ہے

مرا سفر تن تنہا نہیں ، مرے ہمراہ
طویل سلسلۂ دشت ابتلا بھی ہے

یہ سب کھلی ہوئی آنکھیں، ہے اک سرابِ نظر
پکارتے ہو کسے کوئی جاگتا بھی ہے

ترے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں
یہ بے حدود بھی ہے اور تسمہ پا بھی ہے

سماعتوں پہ کسی روز منکشف ہوگی
مری صداؤں میں شامل تری نوا بھی ہے

درونِ خاک فروزاں جنوں کا ہے اعجاز
برہنہ سر بھی ہے یاور برہنہ پا بھی ہے

☆

جاگتا رہتا ہوں لیکن خواب میں رہتا ہوں میں
بزم انجم وادیٔ مہتاب میں رہتا ہوں میں

بنتے مٹتے دائروں اور گردشوں کو کیا خبر
ایک تنکے کی طرح گرداب میں رہتا ہوں میں

میرا گھر بن کر فروزاں ہیں چراغوں کی لویں
مشتعل ہر قطرۂ سیماب میں رہتا ہوں میں

قرب سے میرے دہک اٹھتا ہے پھولوں کا بدن
آگ بن کر خطۂ شاداب میں رہتا ہوں میں

جب کوئی اشکوں سے لکھ دیتا ہے اپنی داستاں
درد بن کر مرکز و اعراب میں رہتا ہوں میں

میں جو تھم جاؤں تو رک جائے نظام رنگ و بو
خون کی صورت رواں اعصاب میں رہتا ہوں میں

میں نے بے مقصد نہیں باندھے ہیں پیروں میں بھنور
جستجوئے گوہر نایاب میں رہتا ہوں میں

دشت ہو، تنہائیاں، دیوانگی، آوارگی
روز و شب اک حلقۂ احباب میں رہتا ہوں میں

چونک اٹھتا ہوں ہر اک آواز پا کے ساتھ ساتھ
منتظر ہوں، دیدۂ بے خواب میں رہتا ہوں میں

قافلے ہوتے ہیں یاورؔ زلف شب میں جب اسیر
التماسِ کرمک شب تاب میں رہتا ہوں میں

☆

شمشیر سے ملا جو مجھے اپنی آل کی
اس زخم دل کی میں نے بہت دیکھ بھال کی

کچھ دیر میں عروج کی ساعت بھی آئے گی
پہونچیں اب اختتام پہ صدیاں زوال کی

بادل گھرے ہوائیں چلیں خوشبوئیں اڑیں
اور برق کوندنے لگی فکر و خیال کی

دیوانگی متاعِ جہاں لے کے کیا کرے
کافی ہے خاک راہ گزارِ غزال کی

اب میں نہ انتظار کی زحمت اٹھاؤں گا
رفتار کم ہے قافلۂ ماہ و سال کی

مہتاب جستجو میں بھٹکتا رہے یونہی
کیا لائے گا مثال مرے بے مثال کی

کس نے کہا تھا برق نگاہی کی مشق کر
قیمت چکا اب آ کے دلِ پائمال کی

حاصل ہوا جو قرب تو پہچان کھوگئی
دریا کو آرزو تھی بہت اتصال کی

اِس دل کی وادیوں میں جو محو خرام ہے
یہ چاند اک کرن ہے بس اُس کے جمال کی

رکھا ہوا دریچۂ نظارگی پہ تھا
لَو کاٹ لی ہوا نے چراغ کمال کی

جتنی ہے مختصر مرے خوابوں کی کائنات
اتنی ہی مختصر ہے کہانی سفال کی

یاورؔ مرا مکان ہے کوئے فراق میں
ممکن نہیں یہاں کبھی دستک وصال کی

☆

کس شعلگی میں قید رہے گزری شب چراغ
دو چار ساعتوں کے ہیں مہمان اب چراغ

ماحول ہے خموش ہوا ، محو خواب ہے
تھرا رہے ہیں خوف سے کیوں بے سبب چراغ

دستک کے ساتھ طاق و در و بام چھوڑ کر
آنکھوں میں جگمگانے لگے سب کے سب چراغ

زندہ ہے روشنی کے جھماکوں سے کائنات
رکھی ہوئی ہے میز پہ تصویر شب چراغ

ہر کوچۂ سوال کو دیتے ہیں رزقِ نور
جلتے نہیں ہیں پوچھ کے نام و نسب چراغ

یہ کاغذی لباس بدن سے اتار دے
رہتے ہیں اس گلی میں بڑے بے ادب چراغ

فردوسیؔ و نظیریؔ و صائبؔ ہوں یا کلیمؔ
ہیں طاقِ احترام پہ روشن یہ سب چراغ

یاورؔ شفق مآب ہوئی رہ گزر تمام
ظاہر ہوا جو بام پہ یاقوت لب چراغ

☆

دشت در دشت وہی ایک صدا
سنگ در سنگ وہی اک پیکر

☆

خوشبو کچھ ایسی علم و ہنر کے شجر میں تھی
ہر چیز مہکی مہکی ہوئی میرے گھر میں تھی

آہیں رہی ہوں یا دمِ آخر کی ہچکیاں
تھوڑی سی زندگی تو ابھی تک کھنڈر میں تھی

اک تازہ تر گلاب مری دسترس میں تھا
اور جنگ معرکے کی چھڑی خیر و شر میں تھی

منزل سے ہمکنار نہ ہوتا کبھی مگر
ہمراہ میرے دھوپ کی سختی سفر میں تھی

افلاک سے زمیں کا سفر کر رہا تھا میں
سرشاریوں کی ریت مگر بال و پر میں تھی

شعلوں کی زد میں وسعتِ کونین تھی تمام
تخلیقیت کی آتشِ بیتاب سر میں تھی

یاورؔ میں تھک گیا تھا مگر میری جستجو
بے انتہا لکیر کی صورت سفر میں تھی

☆

شام کی دہلیز پر شفق کی زبانی
میں نے سنی ہے بغور تیری کہانی

اپنے بزرگوں کے نقشِ پا کی زبانی
کھُل گئے مجھ پر بھی رازِ شہر معانی

خاک تمام آئینہ بہ آئنہ چھانی
کوئی نہیں ہے جہاں میں آپ کا ثانی

جس قدر آئی نشیبِ راہ کی جانب
رنگ پہ آتی گئی ندی کی روانی

ذوقِ سفر بڑھ گیا ہے اور ہمارا
خاک اُڑانے کی جب ہواؤں نے ٹھانی

کیسے کہوں مل گئی ہے منزلِ مقصود
دشتِ جنوں کی کسی نے خاک نہ چھانی

اُس کی ہی باتیں زمانہ سنتا رہے گا
رکھ لیا جس نے وقارِ زورِ بیانی

جلتی ہوئی ریت نے قدم مرے چومے
مہرنے چادر بدن پہ دھوپ کی تانی

سب کی نگاہیں اسی طرف رہیں مرکوز
پیکرِ خاکی پہ جب لباس تھا دھانی

چاند کی آغوش میں جب آئے گی ہنس کر
خود ہی مہکنے لگے گی رات کی رانی

دشتِ نفس سے گزرتے لمحوں نے یاورؔ
لکھی ہے چہرے پہ میرے ، میری کہانی

☆

آوارہ گرد ہوں رہ دیوانگی میں ہوں
تاریکیوں میں ہوتے ہوئے روشنی میں ہوں

تو بھی تو جلتے رہنے کی لذت شناس ہے
اے شمع مطمئن تری ہمسائیگی میں ہوں

مدت سے آبشارِ سخاوت خموش ہے
لیکن میں اب بھی کھویا ہوا نغمگی میں ہوں

اے خنجر جمال ترا منتظر ہوں میں
میں بھی ترا حریف ہوں میدان ہی میں ہوں

سب در ہیں بند سارے دریچے ہیں بے چراغ
یہ کون سا دیار ہے میں کس گلی میں ہوں

گزرے ہوئے دنوں کی نہیں ہے مجھے تلاش
میں اپنے ماہ و سال میں اپنی صدی میں ہوں

مغرور کیوں ہے اس قدر اپنے ہنر پہ تو
دست کمال میں تری مشاطگی میں ہوں

تو مجھ سے دور رہ نہ سکے گا کسی طرح
میں تیرے خال و خد میں تری دلکشی میں ہوں

تو مجھ سے خود کو دور سمجھتا رہے تو کیا
میں تیرا عکس بن کے تری زندگی میں ہوں

اب بھی سمجھ رہا ہوں سرابوں کو سبزہ زار
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر خواب ہی میں ہوں

بستی کے اک مکان میں روشن ہے اک چراغ
ہر شخص کہہ رہا ہے کہ میں روشنی میں ہوں

یاورؔ مری نگاہ سے بچتا نہیں کوئی
مسند نشیں میں شعلۂ تاراجگی میں ہوں

☆

جگمگاتے ہیں در و بام سحر تک اب بھی
قافلے جاتے ہیں کرنوں کے کھنڈر تک اب بھی

کوئی امید نہیں ہے ترے آنے کی مگر
روز جاتا ہے یہ دل راہ گزر تک اب بھی

دن گیا، شب بھی ہم آغوش سحر ہوتی ہے
قافلے آ نہ سکے کوئے نظر تک اب بھی

اس کی یادوں نے تعلق کا بھرم رکھا ہے
دستکیں دینے چلی آتی ہیں در تک اب بھی

خارزاروں کو میں دیتا ہوں لہو کی قسطیں
راستہ کوئی نہیں ہے مرے گھر تک اب بھی

اب وہ پہلے سا گھنا پن نہیں پایا جاتا
واپس آتے ہیں مگر سائے شجر تک اب بھی

آزمایا تو بہت اپنا ہنر موجوں نے
فاصلہ ہے وہی ساحل سے گہر تک اب بھی

کیا خبر کب وہ سماعت ہو کرم پر مائل
گھوم آتی ہے دعا بابِ اثر تک اب بھی

چند افلاک کو سر کرنے سے کیا ہوتا ہے
ہم نہیں پہونچے ہیں معراج سفر تک اب بھی

سبز و شاداب ہوا باغ لہو سے جس کے
اس کو حاصل نہ ہوا ایک ثمر تک اب بھی

روز مینار فلک گیر ہوں تعمیر مگر
کوئی پہنچا نہیں معیار نظر تک اب بھی

آتے جاتے ہوئے چہروں کی شکایت کیسی
مجھ سے مانوس نہیں ہے مرا گھر تک اب بھی

سائبانی کے لئے ہاتھ نہ پہونچا یاورؔ
سنگ آجاتے ہیں لیکن مرے سر تک اب بھی

☆

تعمیر تو کرتا ہوں میں دیوارِ انا روز
ڈھا جاتی ہے لیکن ترے کوچے کی ہوا روز

اک لمس چرا لائے اگر بادِ صبا روز
مہکے تری خوشبو سے مرے گھر کی فضا روز

میں اپنے ہی ہاتھوں سے گرا دیتا ہوں لیکن
بنتا ہے مرا تاج سر اک بال ہما روز

تیری ہی نوازش سے یہ گلزار کھِلے ہیں
زخمی مجھے کرتا ہے ترا سنگ صدا روز

وقت آ کے چھپا دیتا ہے مٹی کی تہوں میں
خود ہی ابھر آتا ہے مرا نقش وفا روز

پیاسے ہی نظر آتے ہیں سب دھوپ کے لشکر
حالانکہ برستا ہے یہاں ابر عطا روز

کرتی ہے رگِ جاں سے مری عرضِ تمنا
چڑھتا ہے ہتھیلی پہ تری رنگ حنا روز

اک وصل کی ساعت نے کیا روز کنارا
اک ہجر کا لمحہ مرا مہمان بنا روز

پڑھتا ہوں میں چہرے پہ لکھی وقت کی تحریر
یاور مجھے ملتا ہے کوئی آئینہ پا روز

☆

تیرگی کی آخری اُڑان ہے
ہر طرف بکھر رہا ہے نور سا

☆

جو ملا اس استعارے کا جواب میں نے دیکھا
وہ لگا رہا تھا سینے سے کتاب میں نے دیکھا

نہ شرارِ ہجر و فرقت کا عتاب میں نے دیکھا
تر و تازہ اس کے چہرے کا گلاب میں نے دیکھا

کبھی آنکھ بند کر کے تجھے سوچنا ہو مشکل
کبھی جاگتے ہوئے بھی ترا خواب میں نے دیکھا

جو نقاب میں نے الٹی کسی روئے زندگی سے
تو لکھا ہوا سرابوں کا نصاب میں نے دیکھا

کئی ایسی ساعتیں بھی مری زندگی میں آئیں
نہ عذاب میں نے دیکھا نہ ثواب میں نے دیکھا

کوئی درمیان آ کر مجھے لے گیا بچا کر
ہو رہائی جس سے مشکل وہ سراب میں نے دیکھا

جو بیان کی حدوں سے بھی گزر چکا ہے آگے
وہ جہان رنگ و بو کا تہہ آب میں نے دیکھا

جو فلک پہ میں نے دیکھا رخِ آفتاب روشن
تو زمین پر جوابِ تب و تاب میں نے دیکھا

جو نہ مل سکی وہ خوشبو مرے شامہ نے چاہی
جو بدل سکے نہ موسم وہ سحاب میں نے دیکھا

جو درونِ ذات یاورؔ کبھی سیر کو گیا میں
نہ مثال جس کی پائی وہ شباب میں نے دیکھا

☆

تذکرے جن کے سب داستانوں میں ہیں
اب وہ صحرا ہمارے مکانوں میں ہیں

بس بلندی ہی ان کا مقدر نہیں
پستیاں بھی بہت آسمانوں میں ہیں

اس قدر دشت میں آگ برسی کہ اب
دھوپ کے قافلے سائبانوں میں ہیں

ہم نہ ہوتے تو ہرگز نہ ہوتا وجود
ہم ہی موجود سارے زمانوں میں ہیں

وہ تبسم مقدر ہے جن کا زوال
ہر کہانی میں ہیں سب فسانوں میں ہیں

اس لئے تیرگی پاس آتی نہیں
روشنی کے شجر آستانوں میں ہیں

اب کہاں کوئی یوسف ہے بازار ہے
اس قدر رونقیں کیوں دکانوں میں ہیں

گردنیں کٹ چکیں حوصلوں کی مگر
کربلائیں بہت امتحانوں میں ہیں

خار و خس خوف سے تھرتھراتے رہیں
ہم تو مصروف اپنی اذانوں میں ہیں

اک نظر خاکساروں کی جانب بھی کر
ہم کہ شامل ترے ساربانوں میں ہیں

اس سے آگاہ یاورؔ نہیں خود بھی میں
زاویئے کتنے میری اڑانوں میں ہیں

☆

ایک بجھتے ہوئے موسم کا نشاں رہ گیا ہے
روشنی ڈوب چکی صرف دھواں رہ گیا ہے

وہ گیا وقت ہے کیا ذکر کروں میں اس کا
اس سے اب کوئی تعلق ہی کہاں رہ گیا ہے

اک پرت اور بھی مٹی کی ہٹانی ہوگی
اک گہر اور بھی آنکھوں سے نہاں رہ گیا ہے

اس طرح خاک نے آئینے کو گھیرا ہے کہ اب
خاک ہی خاک فقط ورد زباں رہ گیا ہے

اپنے ہونے کی خبر کس کے لئے رکھی جائے
خیریت پوچھنے والا ہی کہاں رہ گیا ہے

شہر ہوتا تھا کبھی اب ہے فقط ویرانہ
تو بھی آجا کہ یہی ایک مکاں رہ گیا ہے

رات تاریک ہے اور مجھ کو سفر ہے درپیش
میرا مہتاب مرا چاند کہاں رہ گیا ہے

کوئی گم کردۂ منزل نہ ملے گا سر راہ
نقش پا میرا کراں تا بہ کراں رہ گیا ہے

بدگمانی کا جو اک عکس ہے چہرے پہ ترے
یہ مرے نقش یقیں کا ہی نشاں رہ گیا ہے

ایک مدت ہوئی یاورؔ مجھے خاموش ہوئے
دشت تا دشت مگر شورِ فغاں رہ گیا ہے

سیر گلشن کے لئے کوئی نہ آتا یاورؔ
اس نے چاہا تو گل نام و نشاں رہ گیا ہے

☆

دست و پا مارتا ہے منظرِ صحرائی کہ میں
کامراں کون ہے دشتِ سخن آرائی کہ میں

میں تھا گردابِ بلا خیز کے ہاتھوں میں کہ تو
ناپتا تؤ مرے دریاؤں کی گہرائی کہ میں

اپنے لہجے پہ ذرا غور کر اور مجھ کو بتا
تو نہیں جانتا مفہومِ شکیبائی کہ میں

چاک پیراہنِ ادراک کیا ہے کس نے
کہہ تؤ مشہور ہے دیوانہ و سودائی کہ میں

اتنی تفصیل میں جانے سے ہے بہتر یہ بتا
کیا پسند آیا اُسے شوکتِ دارائی کہ میں

آگ میں اپنی جلا کرتے ہیں پیہم دونوں
ایک جیسے ہیں وہ ہو شعلۂ صحرائی کہ میں

جب اَجل آئے گی کچھ کام نہیں آئیگا
وہ ہو دولت کہ ہو عزت کہ ہو دانائی کہ میں

آہوئے ناز گزیدہ کیلئے وقف ہیں سب
ذہن ہو دل ہو سماعت ہو کہ بینائی کہ میں

میرا گھر خلق و رواداری کا آئینہ ہے
ایک ہی جیسے ہیں یاور ہوں مرے بھائی کہ میں

☆

روشن شب سیاہ میں ہوگا ستارا کیا
تخلیق کرلیا ہے کوئی استعارہ کیا

تشبیہ کیا ، علامتیں کیا ، استعارہ کیا
کیسا گلاب ، اُس کیلئے ماہ پارہ کیا

ہم نے تو خاک حرفِ تعلق پہ ڈال دی
نفع و ضرر سے اب کوئی رشتہ ہمارا کیا

اُجڑے چمن میں بادِ صبا آئی کس لئے
ہونے لگا ہے خاک پہ ہی اب گزارا کیا

اُگتی ہے فصل آب ہر اک کشت زار میں
مٹی میں مل گیا ہے کوئی ابر پارہ کیا

باقی رہا نہ طاقِ تبسم نہ بامِ شوق
آیا ہوں لوٹ کر تو ہے گھر کا نظارا کیا

اکثر سماعتوں میں بج اٹھتی ہیں گھنٹیاں
یہ بھی ہے اُس کی سمت سے کوئی اشارا کیا

ہر وقت کی یہ سمع خراشی عذاب ہے
اے خانہ زاد کرلوں میں تجھ سے کنارا کیا

صحرا کی سمت چل دیئے وحشت کے قافلے
پیراہن آگہی کا ہوا پارہ پارہ کیا

سنتا ہوں تذکرے میں ہیں افکارِ نو بہ نو
آیا ہے ہجر یار کا تازہ شمارہ کیا

کیوں ابر محو گریہ و زاری ہے شام سے
بجلی چمک کے کرتی ہے یاور اشارا کیا

رباعیات

☆

کس در سے دراز سے در آئی خوشبو
ہر گوشۂ احساس پہ چھائی خوشبو
یادوں کے دریچے جو کئے وا میں نے
لہراتی ہوئی کمرے میں آئی خوشبو

☆

دوشیزۂ خواب چومتی ہے مجھ کو
تصویرِ شباب چومتی ہے مجھ کو
کانٹوں سے بچاؤں اپنا دامن کیسے
خود شاخِ گلاب چومتی ہے مجھ کو

☆

صدیوں سے خراج مانگتی دیواریں
کیسی تھیں عجب مکان کی دیواریں
طوفان لہولہان ہوکر گذرے
آوارہ ہوا گرا گئی دیواریں

☆

وہ مشقِ سخن مجھ کو کرانے آئے
کچھ عیب و ہنر فن کے بتانے آئے
جب ہوگئی تصویر مکمل میری
بادل مرا ہر نقش مٹانے آئے

☆

ہونٹوں کے گلاب چومتا ہے شاید
جھونکا کوئی گستاخ ہوا ہے شاید
یہ رات یہ روشنی یہ سیلاب جمال
اس کا آنچل سرک گیا ہے شاید

☆

رخشندہ و افلاک نشیں خواب مرے
پھولوں سے زیادہ ہیں حسیں خواب مرے
کیسی ہے سرشت کیسا پایا ہے مزاج
تعبیر سے ملتے ہی نہیں خواب مرے

☆

اٹھتی ہوئی ہر گھٹا سے ڈرنا کیسا
ماحول میں خوف کے ٹھہرنا کیسا
چٹان کا سایہ کر رہا ہوں میں تلاش
کچی مٹی کے گھر میں مرنا کیسا

☆

ناصح نے کیا جو منع بولا اک شخص
اک جرم قبیح یہ نصیحت ہے یہاں
جس چیز کو آپ کہہ رہے ہیں گالی
دراصل وہی نشان عظمت ہے یہاں

☆

مجبوری و بے بسی سے اپنی آگاہ
تنہائی کے صحرا میں کھڑا ہے سر راہ
ہر شاخ ہے کاسۂ گدائی تھامے
اے ابر گریز پا ادھر ایک نگاہ

PAS-E-GHUBAR

By : Yawar Warsi

۷۸۶/۹۲

سخن کے ہر طاق پر شمع فکر روشن کرنا اور اس شمع کو قندیل ندرت عطا کرنا ہر فنکار کا مقدر نہیں۔ یہ توفیق تو صرف اسے ملتی ہے جس نے سلگتے اور تڑپتے جذبوں کو تطہیر و تقدیس کے سائے میں پروان چڑھایا ہو اور شاخ تخیل پر نادر فکر اور راسخ ذکر کے گل بوٹے سجائے ہوں اور یہ توفیق جناب یاور وارثی کو خالق علم و ہنر نے خوب خوب عطا فرمائی ہے۔ ''پس غبار'' کا ہر صفحہ ایک نئے مہتاب کی طرح روشن ہو کر اپنے قاری کو مستفیض و مستنیر کرتا ہے تیز پس غبار مخفی گوہروں کو تابندگی مستقل سے ہم آغوش کرتا ہے۔

محترم یاور وارثی ایک قادر الکلام نغز گو، پر گو اور حق گو شاعر و ادیب ہیں جن کی طلعت فکر کا امتیاز و اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں نئے موسموں اور تازہ منظروں کے شاداب چہروں کی رونمائی تخلیقیت کے ہر بلند معیار کے مطابق کرتے رہتے ہیں۔ جس سے اہل فن اور اہل نظر مسرور و شادماں ہو کر انہیں اپنی مخصوص دعاؤں سے نوازتے رہتے ہیں۔

پس غبار کیا ہے ذرا خلوص کے دامن کو زحمت دیجئے اور محبت کی ہوا چلنے دیجئے آپ پر خود بھی آشکارا ہو جائے گا اور آپ بھی ہماری گفتگو کے مؤید و مصدق بن کر اعتراف کے گلشن کی سیر کرنے لگیں گے۔ یاور بھائی دو خوبصورت اور عقیدت بردوش نعتیہ مجموعوں کی اشاعت کے بعد غزل کا مؤقر اور جاذب نظر مجموعہ ''پس غبار'' بہت بہت مبارک ہو۔

.....(مولانا) محمد قاسم جیسی برکاتی

جنرل سکریٹری نعت اکیڈمی کانپور

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-576-3

₹ 250.00

Designed by : Hira Akram